جہاں استاد داغ دہلوی

داغیات اور انتخابِ غزلیات

از

کالی داس گپتا رضا

سہ ماہی

اسباق

پونہ

کی اہم پیش کش

قیمت ۴۰ روپے

پبلی کیشنز۔ سائرہ منزل سروے نمبر ۲۳۰ 'بی' پلاٹ نمبر ۱۰۲ الورا گاؤں روڈ' وِمان درشن پونہ ۳۲

اشاعت کا ۱۶واں سال ۔ اپریل، مئی، جون ۱۹۹۷ء

زیرِ سرپرستی
کالی داس گپتا رضا

مدیر
نذیر فتح پوری

معاونین
عبد الاحد ساز
دلدار ھاشمی

اس شمارے کی قیمت ۴۰ روپے

زرِ سالانہ ۔ ۵۵ روپے
معاونین سے ۔ ۱۵۰ روپے

لائف ممبر ۔ ۶۰۰ روپے
اداروں سے ۔ ۱۰۰۰ روپے

لائبریری سے سالانہ ۶۵ روپے

دفتر اسباق ۔ "سائرہ منزل" سروے نمبر B-230 پلاٹ نمبر ۱۵
وِمان درشن لوگاؤں روڈ
پونہ 411032

پرنٹر، پبلیشر اور مالک نذیر فتحپوری نے پربھات پریس پونہ سے چھاپ کر وِمان درشن لوہ گاؤں روڈ پونہ ۳۲ سے شائع کیا۔

اداریہ

گفتِ باہمی

جہاں استاد داغ دہلوی" سے متعلق خصوصی پیشکش حاضرِ خدمت ہے۔ ہم دسمبر ۱۹۹۶ء کے شمارے میں بتا چکے ہیں کہ مشہور ادیب و دانشور، شاعر اور محقق اسباق کے سرپرست جناب کالی داس گپتا رضا کی تصنیف "جہاں استاد داغ دہلوی (داغیات اور انتخاب غزلیات) کتابی صورت میں شائع کی جا رہی تھی لیکن ہماری استدعا پر موصوف نے مسودہ ہمارے سپرد کر دیا اور اسباق کے قارئین کے لیے پیش کرنے کی اجازت دے دی۔

ہمارا ادب لاکھ جدید، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مراحل طے کرتے کے بعد نئے جہانوں کی تلاش میں نکل پڑے لیکن ہم اپنی روایتوں سے انحراف کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ میر، غالب، مومن، ذوق، داغ سے لے کر اقبال، فراق اور فیض کی شاعری کے مطالعے کی ہمیں قدم قدم پر ضرورت محسوس ہوتی ہے ہم ان کے فکری اور فنی منزلوں سے گزر کر ہی اپنے فن کو نکھار سکتے ہیں۔

روایتوں کا ۔۔ تحفظ آئندہ نسلوں کے حق میں مینارۂ نور ثابت ہوگا۔ داغ سے متعلق یہ شمارہ اس مینارے کی تعمیر میں بنیادی اینٹ کا کام کر سکتا ہے۔

ہمیں آپ کی قیمتی رائے کا انتظار ہے۔

نذیر فتح پوری

جہانِ استاد داغ دہلوی

(داغیات اور انتخابِ غزلیات)

تالیف،
تحقیق اور انتخاب

کالی داس گپتا رضاؔ

اسباق پبلی کیشنز۔ پونے (مہاراشٹرا)

فہرست

جہانِ استادِ داغؔ دہلوی

(نگاشتہ ۱۹۶۰ء)

آج کی نہیں ۱۵۲ برس پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو شام کے ۶ بجے اکبر شاہ ثانی شاہِ دہلی کا انتقال ہو گیا۔ یہ کوئی ایسے دُکھ کی بات نہ تھی۔ یہ کیا کم ہے کہ اس ۸۲ سالہ کم علم، کم عقل اور کمزور بادشاہ کے مرنے پر ۸۲ توپیں داغی گئیں۔ انتقال کے ۹ گھنٹے بعد ۲۹ ستمبر ۱۸۳۷ء کو علی الصباح ۳ بجے شہزادہ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کے خطاب کے ساتھ تخت پر بیٹھے۔ یہ بھی کوئی سُکھ کی بات نہ تھی کیونکہ شاہ ظفرؔ کی تخت نشینی مغلیہ شاہی خاندان کی آخری تخت نشینی ثابت ہوئی۔ تخت نشینی کے چند ہفتوں کے بعد ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو انگریزوں نے راج دربار سے فارسی زبان خارج کرنے کا حکم صادر فرمایا اس سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ایک بدیشی زبان گئی اور دوسری بدیشی زبان رائج ہو گئی۔ گویا اب فارسی کی جگہ انگریزی کا بول بالا ہو گیا ہاں جب سال، ڈیڑھ سال بعد شاید ۱۸۳۸ء ہی میں شستہ و رفتہ اردو برتنے والے مگر سنگلاخ زمینوں کے عظیم شاعر انتقال کر گئے تو گویا ایک سانحہ ہو گیا۔ یہ جگت استاد شاہ نصیرؔ تھے۔ یہ وہی شاہ نصیرؔ

ہیں جن کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؂

خیالِ زلف میں ہر دم نصیرؔ پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

یہ شاہ ظفرؔ کے بھی (ایامِ شاہزادگی میں) استاد تھے، ذوقؔ کے بھی مومنؔ کے بھی، غالبؔ کے خسر معروفؔ کے بھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خود غالبؔ کے بھی۔ حافظ غلام رسول شوقؔ جو نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں ؂

مومنؔ و آزردہؔ، غالبؔ، ذوقؔ، شوقؔ
شاعری کے فن میں سب مل ایک ہیں
فیض سے جس کے ہوئے ہیں فیض یاب
وہ نصیرؔ استادِ کامل ایک ہیں

(یعنی مومنؔ، آزردہؔ، غالبؔ، ذوقؔ، شوقؔ سب فن میں ایک سے ہیں اور سب استادِ کامل نصیرؔ سے فیض یافتہ یعنی شاگرد ہیں) جو لوگ اس موقف کو نہیں مانتے وہ اتنا تو مانتے ہی ہیں کہ غالبؔ، شاہ نصیرؔ کی استادی کے قائل اور کہیں کہیں مقلد بھی تھے [1]۔
غالبؔ کی کئی غزلیں جو مشکل زمینوں میں ہیں شاہ نصیرؔ ہی کی

---

[1] غالبؔ نے اپنے ایک خط بنام ناسخؔ میں شاہ نصیرؔ کی استادی پر طنز کیا ہے۔ ممکن ہے وہ محض ناسخؔ کو خوش کرنے کے لیے ہو

کے متبع میں ہیں۔ چند غزلوں کے پہلے مصرعے دیکھیے ؎

- جوں بوے گل یہاں تلک از خود رسیدہ ہوں
- اٹھی گھٹا ہے کس طرح بولے وہ زلف اُٹھا کہ یوں
- تن لاغر ترے بیمار کا کب بار بستر ہے
- جب کہ مستی سے جنوں دشت دکھاتا ہے مجھے
- بلبلو چاہیے گل سوختہ جانی مانگے
- زندگی مشکل ہے دشتِ اشک سے پانی مجھے وغیرہ وغیرہ

شاہ نصیر ایسے نامور شاعر کے انتقال کا دکھ راجا اور پرجا کے لیے بھلے ہی معمولی دکھ ہو مگر مجھ ایسے درویش کے لیے دُونا ہے۔ بقول کبیر ؎

راجا دُکھیا پرجا دُکھیا جوگی کا دُکھ دونا
کہہ کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں سونا

اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ نصیر میرے نامور دادا استاد کے نامور دادا استاد تھے۔

میرے دادا استاد کا نام مرزا خاں اور تخلص داغ تھا اور وہ اپنے آخری دور میں "جہاں استاد، بلبلِ ہزار داستاں، مقربِ الخاقانِ زمن، استاد السلطانِ دکن، فصیح الملک، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ" نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی کہلائے۔ شاہ نصیر کی وفات کے وقت داغ محض سات سال کے تھے۔

داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چاندنی چوک میں پیدا ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصل نام نواب ابراہیم تھا۔ شادی کے بعد ان کے احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا اور وہ آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہو گئے[۱] مگر یہ روایت تصدیق شدہ نہیں، شاید نام ابراہیم خاں ہو مگر "نواب مرزا نام .... یقیناً والدہ کا رکھا ہوا ہے[۲]"۔ اب یہ مصدقہ ہے کہ داغ کے والد کا نام نواب شمس الدین احمد خاں اور والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا جو دہلی کے ایک کشمیری خاندان سے تھیں اور نہایت خوبصورت تھیں۔

چاندنی چوک والا مکان جس میں داغ کا جنم ہوا، داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں نے داغ کی والدہ کو دلا رکھا تھا۔ داغ ابھی پانچ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر ریذیڈنٹ دہلی، کے قتل کے الزام میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی دے دی گئی۔ والد داغ کے پھانسی پانے کے بعد بھی داغ اور ان کی والدہ اسی چاندنی چوک والے مکان میں رہتے رہے۔ داغ کی خالہ عمدہ خانم، نواب یوسف علی خاں (رام پور) سے وابستہ تھیں۔ ۱۸۳۵ء کے بعد جب تک نواب یوسف علی خاں اور عمدہ خانم دہلی میں رہے، عمدہ خانم نے داغ کی پرورش کی۔ بعد میں جب نواب محمد سعید خاں تخت نشین رام پور ہوئے تو نواب یوسف علی خاں اور عمدہ خانم بھی رام پور چلے آئے۔ داغ بھی بعمر ۹ سال انہیں کے ساتھ آگئے۔ وہاں داغ نے مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات سے فارسی پڑھی۔

---

[۱] آئینہ داغ ص ۶۔ جلوہ داغ ص ۸

[۲] نواب مرزا خاں داغ از تمکین اعظمی ص ۲۲

کہا جاتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے بھی انہیں سکندر نامہ پڑھایا تھا۔
جب داؔغ کی والدہ چھوٹی بیگم ۱۸۴۴ء میں شاہ ظفرؔ کے بیٹے ولی عہد مرزا فخرو سے وابستہ ہوئیں تو داؔغ کو بھی ۱۴ سال کی عمر میں قلعہ معلّیٰ ہی میں طلب کر لیا گیا اور داؔغ کی زندگی چین ہی سے نہیں بلکہ آرام و آسائش میں گذرنے لگی۔ تعلیم بھی جاری رہی اور اب کے شاہی قلعے میں میر غلام حسین شکیباؔ شاگرد میر تقی میرؔ، کے لڑکے میر احمد حسین ان کے استاد تھے۔ وہیں خطاطی و خوش نویسی میر پنجہ کش سے سیکھی اور فن سپہ گری کئی دوسرے استادوں کے علاوہ خود ولی عہد مرزا فخرو سے سیکھا۔ اگلے ہی سال داؔغ کی والدہ نے داؔغ کی شادی فاطمہ بیگم سے کردی تاکہ وہ قلعے کی فضا سے جو نوجوانوں کے حق میں اکثر مسموم ثابت ہوا کرتی تھی، دور رہیں۔ وہاں وہ پہلے مرزا فخرو کے، بعد ازاں چندے مرزا فخرو کے ایما سے، ذوقؔ کے شاگرد ہوئے اور ۱۸۵۴ء یعنی استاد ذوقؔ کی رحلت تک، ان سے اصلاح لیتے رہے۔ پہلے مرزا تخلص تھا۔ داؔغ تخلص مرزا فخرو کا دیا ہوا ہے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد قلعے سے باہر کا بیشتر وقت اب غالبؔ کی صحبت میں گذرنے لگا تھا کہ ۱۸۵۶ء میں یکایک مرزا فخرو کا انتقال ہوا اور داؔغ پھر پدرانہ شفقتوں سے محروم ہو گئے۔ داؔغ کو اس کا بہت صدمہ ہوا چنانچہ مرزا فخرو کے انتقال کی جو تاریخ انہوں نے کہی ہے وہ ان کے دکھی دل کی غماز ہے، فرماتے ہیں ؎

غمِ نتیجِ ملکِ سلطاں چہ بلائے جان و دل شد
وبہ بخشش مقامِ جنّت ز کرم کریم غفّار
چو ز داؔغ سالِ رحلت دلِ دردمند پرسید
بکشید آہِ حسرت دو صد و دوازدہ بار

[یعنی جب دُکھی دل نے داغؔ سے مرزا فخرو کے انتقال کا سنہ پوچھا تو داغؔ نے ۲۱۲ بار حسرت بھری آہ کھینچی۔ بحساب ابجد آہ کے عدد ۶ ہوتے ہیں اسے جب ۲۱۲ سے ضرب دیں تو ۱۲۷۲ کے عدد حاصل ہوں گے یعنی ۱۲۷۲ھ ہجری جو برابر ہے ۱۸۵۶ء کے] مرزا فخرو کے انتقال کے بعد داغؔ اور ان کی والدہ کو قلعہ چھوڑنا پڑا۔ دن رات کی رنگ رلیاں رقص و سرود کی محفلیں، شعر و سخن کی مجلسیں، بیتے یگ کی کہانیاں بن کر رہ گئیں۔ البتہ یہ ہے کہ قلعے میں داخل ہونے والا ۱۳ سالہ طالب علم جب ۱۲ سال بعد قلعے سے خارج کیا گیا تو شاعر کامل بن چکا تھا۔

۱۸۵۶ء کا سال اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے پورے ہنگامے یعنی آخری سال تک، داغؔ دہلی ہی میں رہے (شاید اُسی اپنے چاندنی چوک والے مکان میں) اور ان کی والدہ کی تنخواہ قلعے سے مقرر تھی۔ وہ انہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک برابر ملتی رہی۔ جب قلعہ اور قلعے والے لُٹ گئے تو تنخواہ کیسی؟ خود کہتے ہیں ؎

اے داغؔ اہلِ قلعہ کا لٹنا تو در کنار
تنخواہ تک خزانۂ شاہی میں رہ گئی

آخر ۱۸۵۷ء میں داغؔ اپنی خالہ عمدہ خانم کا سفارشی خط بنام نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور لے کر رام پور آگئے اور غالباً سال بھر رام پور میں اطمینان کی زندگی گذار کر ۱۸۵۹ء کے شروع میں دہلی پلٹ آئے۔ پھر اسی طرح ۱۳ اپریل ۱۸۶۶ء تک رام پور آتے جاتے رہے۔ اس مدت میں نواب یوسف علی خاں کی وفات ۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء تک

وہ ولی عہد کے مصاحبوں میں شامل رہے اور جب ولی عہد نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور ہو گئے تو ان کے مہمان بن کر رہے حتیٰ کہ ۴ر اپریل ۱۸۶۶ء کو انہیں ۷۰ روپے ماہوار تنخواہ پر داروغۂ فراش خانہ و اصطبل مقرر کیا گیا۔ یہاں داغ نے بڑا فروغ پایا۔ نواب کلب علی خاں نے نہ صرف انہیں ریاست میں باقاعدہ ملازم فرما کر اپنی مصاحبت میں مقرر کیا بلکہ ماہوار تنخواہ کے علاوہ جیب خاص سے بھی بہت کچھ سلوک روا رکھا۔ داغ کے کئی شعر اس کے شاہد ہیں ؎

رئیس مصطفےٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے
کہیں کیا داغ ہم، آرام ہم نے کس قدر پایا

سب اسے رام پور کہتے ہیں ؎ ہم تو آرام پور کہتے ہیں

داغ کے اس عروج پر رقابت کے شعلے بھڑکنا بھی فطری ہی تھا۔ چنانچہ ایک دن جب داغ اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک شعر چسپاں دیکھا ؎

شہر دہلی سے آیا اک مُشکی
آتے ہی اصطبل میں داغ ہُوا

داغ نے شاعر کی ذہانت کی داد دی اور ہنس دیے۔ کہتے ہیں کہ شعر میر احمد علی رسا رام پوری کے شاگرد شیخ علی بخش بیمار نے کہا تھا۔ واللہ اعلم

غرض اس رشک و رقابت مگر نہایت آرام و آسایش کے ماحول میں داغ نے رام پور میں ۲۱ سال کاٹ دیے۔ اس اثنا میں انھوں نے کئی سفر بھی کئے، مگر دو سفر اہم ہیں۔ دسمبر ۱۸۶۶ء میں نواب صاحب کی ہم رکابی میں کلکتہ کا سفر کیا اور ۱۸۷۲ء میں اُنہی کی معیت میں حج بیت اللہ سے مشرّف ہوئے۔

جب حج کے سفر کی ٹھہری تو داغ نے ۱۵ شعر کی ایک غزل کہی۔ چند شعر حاضر ہیں، مقطع میں خاص اسی طرف اشارہ ہے ہے

مری موت خواب میں دیکھ کر ہوئے خوب اپنی نظر سے خوش
اُنہیں عید کی سی خوشی ہوئی، رہے شام تک وہ سحر سے خوش

—

وہی دوست ہیں وہی آشنا، وہی آسماں ہے وہی زمیں
عجب اتفاقِ زمانہ ہے کہ بشر نہیں ہے بشر سے خوش

—

یہ خوشا نصیب کہ یار نے مری موت غیر سے سُن تو لی
یہ اگرچہ جھوٹ اڑائی تھی وہ ہُوا تو ایسی خبر سے خوش

—

یہ سنا جو حضرتِ داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے یہی فکر ہے شب و روز عزمِ سفر سے خوش[۱]

—

۱؎ گلزارِ داغ ص ۱۱۱

اور کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر ۲۱ اشعار کی ایک غزل کہی۔ ان میں سے چند پیش کیے جاتے ہیں :-

سبق ایسا پڑھا دیا تُو نے ‏ ‏ دل سے سب کچھ بھلا دیا تُو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ‏ ‏ دلِ بے مدعا دیا تُو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا مَیں نے ‏ ‏ کیا کہوں مَیں کہ کیا دیا تُو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو ‏ ‏ بے غرض جو دیا دیا تُو نے
تھا مرا منہ نہ قابلِ لبیک ‏ ‏ کعبہ مجھ کو دکھا دیا تُو نے

داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تُو نے[۱]

جب حج کر کے واپس آئے تو پھر ۹ شعر کی غزل کہی :-

کیوں قسم کھاتے ہو ہم جور سے باز آتے ہیں
ان غریبوں میں کہیں واقفِ راز آتے ہیں
کچھ نہ پوچھو جو صدا آتی ہے مے خانے سے
کبھی مسجد سے جو ہم پڑھ کے نماز آتے ہیں
ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغؔ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں[۲]

۱۔ گلزارِ داغ ص ۲۸۱
۲۔ گلزارِ داغ ص ۱۵۳

ملازمتِ رام پور کے زمانے کے ایک اور سفر کا بیان بھی ضروری ہے۔ یہ کلکتہ کا سفر تھا جو داغ نے ایک ڈیرے دار طوائف مُنّی بائی حجاب کے اصرار پر اپریل ۱۸۸۲ء میں کیا تھا۔ حجاب ۱۸۷۹ء میں بے نظیر کے میلے میں رام پور آئی تھی۔ وہیں سے داغ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ رستے میں پٹنہ میں اُن کی زبردست آؤ بھگت ہوئی۔ نام تو پورے ہندوستان میں پھیل ہی چکا تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دو مشاعرے منعقد ہوئے۔ داغ اوائل اپریل ۱۸۸۲ء میں رام پور سے روانہ ہو کر اواخر اپریل ۱۸۸۲ء میں پٹنہ پہنچے۔ وہاں کئی ہفتے قیام کیا۔ پہلے مشاعرے کا مصرع طرح تھا ع

ادھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں

داغ نے اس مشاعرے میں دو غزلیں پڑھیں پہلے غیر طرحی پھر طرحی۔ پہلے چند شعر غیر طرحی غزل کے دیکھئے ے

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے
ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے
ہر وقت تازہ فقرہ ہے ان کی زبان پر
ہر دم نئی اترتی ہے ان کے دماغ سے
دنیا میں ایسے لوگ مصیبت زدہ کہاں
روئے ہم آج خوب گلے مل کے داغ سے[۱]

طرحی غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ مقطع خاص کر توجہ طلب ہے کیونکہ جب

---

[۱] آفتاب داغ ص ۶۵۔ کل شعر ۱۵

داغ پہنچے ہیں تو سخت گرمی کا موسم تھا ے

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
فسوں ہے یا دعا ہے یہ معمّا کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں
یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائے گا
قیامت بن کے اٹھیں گے، بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں[1]

دوسرا مشاعرہ بھی بڑی شان کا تھا۔ اس میں جو غزل پڑھی تھی اس سے بھی لطف اٹھائیے ے

طُور کے پہلو میں اک بُت خانہ ایسا چاہیئے
شور اُٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہیئے

—

دیکھ کر چاہت مری کہتے ہیں سب اہلِ نظر
گُل کو بلبل، شمع کو پروانہ ایسا چاہیئے

—

[1] آفتابِ داغ ص ۳۴۴ ۔ کل شعر ۱۶

بھیس بدلے حضرت زاہد پئیں چوری چھپے
شہر میں پوشیدہ اک میخانہ ایسا چاہیئے

خوب جی بھر کے سنا پہلے تو قصہ داغ کا
پھر کہا دل تھام کر، افسانہ ایسا چاہیئے[۱]

پٹنہ کے ایک اور مشاعرے کا ذکر ملتا ہے[۲]۔ وہاں کے ایک رئیس نے ایک مصرع طرح کا اعلان کر دیا۔ مگر داغ کا امتحان یوں لیا کہ انہیں خبر نہ دی اور عین وقت پر معذرت کے ساتھ داغ کو لینے چلے آئے اور مصرع طرح (یہ آباد کبھی خانۂ زنداں نہیں دیکھا) بتایا۔ داغ نے اسی وقت کاتب کو ۲۶ شعر کی غزل لکھوا دی اور مشاعرے میں شرکت کی۔ کچھ شعر یہ ہیں ؎

اس کعبۂ دل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا
اس بت کو کب اللہ کا مہماں نہیں دیکھا

ہم جیسے ہیں ایسا کوئی دانا نہیں پایا
تم جیسے ہو ایسا کوئی ناداں نہیں دیکھا

تم منہ سے کہے جاؤ کہ دیکھا ہے زمانہ
آنکھیں تو یہ کہتی ہیں کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا

۱؎ آفتاب داغ۔ ص ۲۷۔ کل شعر ۲۶

۲؎ نگار۔ داغ نمبر۔ اپریل ۱۹۵۳ء ص ۱۷

کیوں پوچھتے ہو، کون ہے یہ کس کی ہے شہرت
کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

داغ وسطِ ماہ جون میں کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ داغ کی مثنوی فریادِ داغ میں ایک شعر یوں ہے ؎

آٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی ٭ یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

عام طور پر اس شعر کو داغ کی غلط بیانی یا سہو پر محمول کیا جاتا ہے کیونکہ جب وہ اواخر اپریل سے پٹنہ میں موجود ہیں تو وسط جون تک آٹھ دن کیونکر ہوئے؟ کیا یہ کتابت کی غلطی ہے جو خود داغ یا کاتب کے قلم سے در آئی ہے اور جس کی طرف داغ کی زندگی میں اور اس کے بعد آج تک کسی کا دھیان نہیں گیا۔ یہ مثنوی کلکتہ پہنچنے کے چند ہفتوں بعد ہی تصنیف ہو گئی تھی اس لیے اس میں قیامِ پٹنہ کی مدت اتنی غلط درج نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آٹھ نہیں ساٹھ ہو۔ خیال فرمائیے آٹھ ہی دن میں داغ کی طبیعت پٹنہ سے کیونکر سیر ہو سکتی ہے؟
اس شعر کو یوں کیوں نہ پڑھیے ؎
ساٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی
یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

اصل یہ ہے کہ داغ نے آٹھ دن محاورۃً استعمال کیا ہے۔ جیسے آٹھ پہر یعنی دن رات۔ آٹھ دن یعنی بہت دن۔ داغ کلکتہ میں بھی خوب چمکے۔

مشاعرے بھی لُوٹے، رؤسا اور مٹیا بُرج کے شاہی خاندان میں مقبول بھی ہوئے۔ آخر کار نواب رام پور کی فوری طلبی پر جولائی ۱۸۸۲ء میں واپس رام پور آ گئے۔ مزید تقریباً پونے پانچ برس اسی بے فکری میں گذر گئے کہ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا داغ کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔ آخر کار یہ کہتے ہوئے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو رام پور سے چلے آئے کہ ؎

رہے کیا مُصطفٰے آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

مصطفٰی آباد، رام پور کو کہتے ہیں اور خلد آشیاں سے مُراد نواب کلبِ علی خاں مرحوم ہیں۔ یہ ۱۶ شعر کی ایک غزل کا مقطع ہے جو داغ نے، ظاہر ہے کہ رام پور چھوڑنے سے چند روز پہلے یا چند دن بعد کہی ہوگی۔ کتابوں میں اس مقطع کی قرأت کچھ اور رہی ہے اور داغ کے تیسرے دیوان مہتابِ داغ میں کچھ اور۔ غزل کے پانچ مزید شعر مع مقطع دیکھیے ؎

یہ سب جھگڑے ہیں جان ناتواں تک
رہے گا دم کہاں تک غم کہاں تک
زباں سے تھا نہ ممکن شکوۂ جور
اشاروں سے کہا آخر کہاں تک
دل اس کی بزم سے کس طرح اکھڑے
ٹھہر جائے گی جاں عمرِ رواں تک

زمیں ٹل جائے، ٹلنے کے نہیں ہم
کہ اب تو آ گئے اس آستاں تک
کہوں کیا طالع واژوں کی تاثیر
گرا ہوں میں پہنچ کر آسماں تک
رہے کیا مصطفٰے آباد میں داغؔ
وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

جب داغؔ نے "گرا ہوں میں پہنچ کر آسماں تک" کہا ہوگا تو یقیناً ان کے ذہن میں یہی رہا ہوگا کہ رام پور میں جو عروج انہیں حاصل ہوا تھا وہ اب دوبارہ ملنے کا نہیں مگر یہ تو ابھی پہلا ہی آسمان تھا انہیں تو سات آسمان کا عروج حاصل ہونا تھا۔ بس، پردہ گرنے کی منتظر تھی نگاہ۔ اب کے انہوں نے حیدر آباد کا رُخ کیا۔ حیدر آباد میں لگ بھگ سوا تین سال کی بھاگ دوڑ کے بعد ۶ فروری ۱۸۹۱ء اتوار کی رات کو ۹ بجے نظام والی حیدر آباد دکن کی غزل برائے اصلاح سر بمہر لفافے میں چند چوبدار لے کر حاضر ہوئے جسے داغؔ نے فوراً اصلاح کر کے واپس کر دیا۔ گویا تاجدار دکن نے انہیں استاد بنا لیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو روزِ اوّل سے تنخواہ کا حکم صادر ہوا ۸ نومبر ۱۸۹۳ء کو وہ بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک کے خطابات سے نوازا گیا۔ انعام و اکرام اور دیگر فتوحات کی کوئی حد نہ رہی۔ اس طرح داغؔ کی جو قدر و منزلت حیدر آباد میں ہوئی وہ آج تک کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔
داغؔ کی زندگی کے کوائف یہیں تک بس ہیں مگر تکمیل کے لیے

دو ایک باتیں اور سن لیجیے۔ پہلی یہ کہ تقریباً دسمبر ۱۸۹۸ء میں داغ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ داغ کی شادی ۱۵ سال کی عمر میں ۱۸۴۶ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح ۵۲ سال کی رفاقت تھی۔ داغ نے اس کا بہت سوگ منایا۔ اہلیہ کی صفت میں داغ ایک خط میں لکھتے ہیں "مرحومہ زبانِ اردو پر بہت قابض تھیں۔ اکثر محاوروں میں مجھ کو مدد ملتی تھی"۔

۵ ستمبر ۱۹۰۰ء کو امیرؔ مینائی حیدرآباد پہنچے۔ داغ نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ اپنا مہمان بنایا، مگر ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو اس نامی گرامی شاعر کا انتقال ہوگیا۔ چونکہ امیرؔ مینائی ایک طرح سے داغ کے حریف بھی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے امیرؔ کے حواریوں نے ان کی موت کا الزام داغ کے سر رکھنا چاہا مگر یہ سراسر غلط تھا۔ داغ کو اس موت کا دلی صدمہ تھا۔

داغ کی صحت ۱۸۶۶ء سے جو خراب ہوئی تو خراب ہی رہی۔ آخری عمر میں تو طرح طرح کے عارضوں نے گھیر لیا تھا بالآخر ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو اس عہد ساز شاعر نے لگ بھگ ۷۴ سال زندگی گزار کر آخری سانس لی۔ در و دیوار داغ ہی کے لفظوں میں پکار اٹھے ؎

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ نظم بے چراغ ہوا

داغ کی ولادت سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے تک جن مشاہیر شعرائے دہلی کی شعری محفلوں اور ماحول کو گرما رکھا تھا ان میں سے کچھ یہ ہیں :-

مرزا مظہر جانِ جاناں : یہ وہی ہیں جن کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

یہ شعر گویا ان کی شناخت ہے ؎

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم!
یہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا

مظہر کے کلام میں ایک عجیب تڑپ ہے جن کا تعلق دماغ سے کم دل سے زیادہ رہتا ہے۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو فارسی غزل کی طرح داری بخشی۔ اس سے پہلے اردو شاعری میں ایہام گوئی کا بہت زور تھا۔

مرزا محمد رفیع سودا : سودا کے یہاں زبان کی صفائی اور بیان کی سلاست کم ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غزلوں میں قصیدوں کی زبان استعمال کی۔ اس طرح غزل گوئی کا ایک نیا معیار قائم کیا، مگر ان کی مقبولیت عام نہ ہو سکی۔ تاہم ان کے یہاں جو طنطنہ پایا جاتا ہے وہ کسی اور کے بس کا نہیں۔ اور ان کے جید شاعر ہونے میں بھی کلام نہیں ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

سوداؔ تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سے کچھ لپٹتا ہے
غنچہ سمٹے تو سمٹے ممکن ہے
دل جو بکھرے تو کب سمٹتا ہے

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

محمد تقی میرؔ : میرؔ اردو غزل کے بادشاہ ہیں۔ کوئی ایسا شاعر، استاد یا استاد گر نہیں جو میرؔ کے کلام کا معترف نہ ہو۔ میرؔ کے باطن میں حزن و یاس بہت تھا اور وہ اسی کو اپنی غزلوں میں ڈھالتے تھے۔ رطب و یابس خارج کر دینے کے بعد ان کا جو کلام منتخب ہے (اور وہ بھی تعداد میں بہت ہے) اس میں عشق و محبت کے علاوہ آس تراس کے پہلو نمایاں طور پر بیان ہوئے ہیں جو قاری کے دل پر ایک خاص اثر چھوڑتے ہیں کچھ کم مشہور اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر ؏ دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
منہ نہ ہم جبر یوں سے کھلواؤ ؏ کہنے کو اختیار سا ہے کچھ
ضعف پیری میں زندگانی بھی ؏ بوجھ سر پر اپنے بار سا ہے کچھ

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ؛ لہو آتا ہے جب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش ؛ گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا، لیکن ؛ جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

خواجہ میر درد : تصوف کے معاملات میں ان سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں کیونکہ ان کے کلام میں عشق حقیقی کی جھلک موجود رہتی ہے۔ زبان رواں دواں، نرم، ملائم، شستہ اور جامع ہے ؎

سب کے یاں تم ہوئے کرم فرما ؛ اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم ؛ نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا ؛ کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا ؛ تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی ؛ جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی ؛ ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

قصہ چونکہ طول پکڑتا جا رہا ہے اس لیے یہاں میر سوز، اشرف علی فغاں، عبدالحئی تاباں، غلام حسن حسن، سعادت یار خاں رنگین، جعفر علی حسرت، انشاء اللہ خاں انشاء، ایسے مشہور دہلوی شعراء کا ذکر نہیں کیا جاتا تاہم ایک شاعر کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہیں۔
شیخ قلندر بخش جرأت : کلام داغ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی راہ چننے میں داغ نے جرأت سے وافر بہرہ پایا ہے۔ جرأت کی زبان بہت

فصیح ، بامحاورہ اور شوخ تھی۔ حسن و عشق کے معاملات کے لیے موزوں اور عاشق و معشوق کی باہمی گفتگو کے لیے نشہ آور۔ یہی داغؔ کے کلام کی بھی نمایاں خصوصیات ہیں ۔

امشب کسی کا کل کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ
دل چھین لیے اس نے دکھا دستِ صفائی
کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

اس ڈھب سے کیا کیجیے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے ، رہو رات کہیں اور
جس رنگ بھری چشم سے برسے ہے پڑا خون
اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے جب استاد گر شاعر شاہ نصیرؔ کا انتقال ہوا ہے۔ داغؔ سات برس کے تھے مگر شاہ نصیرؔ نے اپنے بعد شاگردوں کی ایک کھیپ چھوڑی جو دہلی میں شاعری کے آسمان پر مہ و انجم بن کر چمکی۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ (استادِ داغؔ) ، مومن خاں مومنؔ ، اور بہادر شاہ ظفرؔ ایسے باکمال شامل ہیں۔ غالبؔ پر بھی شاہ نصیرؔ کا اثر پڑا ہے۔ یہ سب داغؔ کے بزرگ تھے اور اگر ہم عصر تھے تو اس حد تک کہ کسی کا انتقال داغؔ کے سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے نہیں ہوا۔ فرداً فرداً کچھ رائے دی جاتی ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق : اب بھلے ہی یہ اپنے مرتبے پر فائز نہ رہ سکے ہوں مگر ذوق اپنے عہد میں سب سے بڑے شاعر مانے گئے تھے۔ ان میں جوہر شاعری کی کمی نہ تھی مگر طبیعت کے فطری زہد اور اتقا نے ان کے کلام میں وہ نمکینی نہیں آنے دی جس کے مستحق وہ ہو سکتے تھے۔ تاہم ذوق نے حسنِ تعلیل، محاورے اور روزمرّے کو خوب برتا ہے۔ ان کا بیشتر کلام ناصحانہ رنگ لیے ہوئے ہے لیکن لفظی و معنوی صنائع سے مستحکم علمیت سے بھاری بھر کم اور نگینے کی طرح جڑے ہوئے الفاظ سے محتشم و محترم ہے ؎

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ! خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
بس کر اے سوزِ دروں! بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم! جوشِ گریہ! چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بے تابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے
چھیڑتا ہے کس لیے تیرا تصور رات دن
تو تو ہے پردہ نشیں، پھر کیوں نظر آ جائے ہے
نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھ لے ہے جب کہ ہوش آ جائے ہے

مومن خاں مومن : مومن کے کلام کی انفرادیت سنجیدہ معاملہ بندی اور تغزّل ہے۔ جب وہ نازک خیالی کا اضافہ کرتے ہیں تو کلام کی پیچیدگی

بڑھ جاتی ہے جو حصولِ انبساط کا سبب بنتی ہے۔ رعایتِ لفظی بھی اکثر پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ اسے معنی کی خوبیاں بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مقامات پر وہ نازک خیالی میں اپنے تمام ہمعصروں پر سبقت لے جاتے ہیں۔ حتٰی کہ غالبؔ پر بھی۔ مجموعی طور پر طبیعت جدت طراز تھی۔ ان کی یہ مشہور غزل، تو سب نے سُنی ہوگی ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِؔ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہادر شاہ ظفرؔ: ظفرؔ کے یہاں اگرچہ شاہ نصیرؔ کی طرح سنگلاخ زمینوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے تاہم اُن کے کلام میں روانی اور ترنم یقیناً زیادہ ہے۔ پورا کلام جرأتؔ، نصیرؔ، ذوقؔ کے مختلف رنگوں کی جھلک لیے ہوئے ہے۔ ہندی الاصل الفاظ کا استعمال نسبتاً

زیادہ ہے۔ رعایت لفظی سے بھی پرہیز نہیں ہے

جام ہے شیشہ ہے ساقی بھی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے

جوشِ مستی بھی ہے ہنگامہ، ہم آغوشی بھی
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے

ساز و مطرب بھی ہے اور نغمہ بھی ہے رقص بھی ہے
ساتھ ہر تار کے آنکھوں سے اشارات بھی ہے

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے

یار ہے، یار کے ہے ساتھ ظفرؔ بوس و کنار
اور اگر چاہیئے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

محمد اسد اللہ بیگ خاں غالبؔ: غالبؔ پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے یہاں تک کہ غالبیات اب اردو ادب کا مستقل موضوع ہے۔ غالبؔ نے اردو میں تفکیری شاعری کی صرف بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ اُسے عروج پر بھی پہنچا دیا۔ ان کی طرفگیٔ ادا اور جدتِ اسلوبِ بیان منفرد ہیں ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

نواب مرزا خاں داغ دہلوی، درجِ بالا اُن اساتذہ کے، جو داغ کے وجود میں آنے سے پہلے ہی صفحۂ ہستی سے غائب ہو چکے تھے، وَرثہ دار تھے اور جن کو داغ نے اپنی جوانی تک دیکھا تھا ان کے عزیزوں میں تھے۔ ذوق کے انتقال کے وقت داغ ۲۳ سال کے تھے، مومن کے انتقال کے وقت ۲۱ سال، ظفر کے انتقال کے وقت ۳۱ سال اور غالب کے انتقال کے وقت ۳۸ سال کے۔ اس طرح داغ نے ان چار موخرالذکر اساتذہ کو جی بھر کے دیکھا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ جونیئر شاعر کی حیثیت سے مشاعرے بھی پڑھے تھے اور اپنی عمر اور نام سے بڑھ کر داد بھی حاصل کی تھی۔ شاہ ظفر نے ایک بار ایک شعر پر انہیں پاس بلا کر انہیں بوسہ دیا تھا۔

بقولِ داغ پہلے پہل انہوں نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشاعرے[۱] میں شرکت کی۔ تب اُن کی عمر ۱۳، ۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ غالب کے علاوہ اس وقت کے تمام مشہور شعراء شریکِ مشاعرہ تھے۔ اس موقع پر داغ نے جو غزل پڑھی تھی اور جس پر انہیں بہت داد ملی تھی، اس کا مطلع تھا ؎

شرر و برق نہیں، شعلہ و سیماب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

اس مطلع والی غزل ان کے کلام میں شامل نہیں، اسی زمین میں دوسری غزل ہے۔ شاید یہ غزل اس دیوانِ اوّلین میں ہوگی جو چوری ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ زینت باڑی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں دوسرے استادوں کے علاوہ مشہور عالم و دانشور مولانا صہبائی بھی موجود تھے۔ جب داغ نے مقطع پڑھا ؎

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں! کیوں ایسی
مجھے کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

تو حاضرین نے بہت داد دی اور صہبائی نے اُٹھ کر گلے سے لگا لیا۔ یہ غزل داغ کے پہلے مطبوعہ دیوان "گلزارِ داغ" میں شامل ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

---

[۱] نسیم رام پوری کا مشاعرہ ۱۸۴۵ء میں ہُوا تھا گویا داغ اس وقت ۱۴-۱۵ سال کے تھے۔ اگر ان سب سے پہلا مشاعرہ شیفتہ کے یہاں تھا تو اس وقت داغ کی عمر ۱۳-۱۴ سال سے زیادہ نہ ہوگی

کب ہوا اے بت بیگانہ بیگانہ منش تو اپنا
دل جو اپنا ہے، نہیں اس پہ بھی قابو اپنا
تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا
آتشِ دل ہی غنیمت ہے شبِ فرقت میں
گرم رہتا ہے اسی آگ سے پہلو اپنا
وہی ہم تھے کہ جو روتوں کو ہنسا دیتے تھے
اب یہ ہے حال کہ تھمتا نہیں آنسو اپنا

۱۸۵۳ء میں قلعۂ معلّٰی میں ایک مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا ؎

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا، دشمن آپ ہم نکلے

اس طرح میں غالبؔ کی غزل بہت مشہور ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

داغؔ کے پاس مصرعہ اس رات پہنچا تھا جس رات کو مشاعرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے غزل کہہ کر دیوان خاص ہی میں استاد ذوقؔ کو دکھائی۔ انہوں نے کہا خاصے شعر ہیں۔ اتنے میں بقولِ داغؔ بادشاہ تشریف لے آئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ داغؔ نے بھی اپنی باری سے غزل شروع کی۔

داغ فرماتے ہیں کہ جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور وہ، جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

تو یہ سُن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس وقت داغ بائیس سال کے تھے۔

۱۸۵۴ء میں ایک مشاعرہ نواب اصغر علی خاں نسیمؔ رام پوری کے ہاں ہوا۔ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ وغیرہ استاد موجود تھے۔ زبان کے لیئے آسماں کے لیے ردیف و قافیہ میں مصرع طرح دیا گیا تھا۔ داغ نے اس زمین میں سرسری سی غزل کہی تھی۔ انہوں نے استاد ذوقؔ سے، جن کا دلی کے مشاعروں میں استادِ شاہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ بول بالا رہتا تھا، اجازت حاصل کرلی کہ وہ (یعنی داغ) طرحی نہیں بلکہ غیر طرحی غزل پڑھیں گے۔ چنانچہ داغ نے غیر طرحی شروع کی۔ ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ مشاعرہ بول اُٹھا ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا

ان کے بعد استاد ذوقؔ کو پڑھنا تھا۔ داغ فرماتے ہیں کہ استاد میری ہر ادا کو دیکھ کر چپکے چپکے بار بار فرماتے جاتے تھے "لاحول ولا قوت کیا فروگذاشت ہوئی ہے"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے غیر طرحی پڑھنے کی اجازت کیوں دے دی۔ اب ان کی طرحی غزل کا رنگ کیونکر جمے گا۔

داغؔ کی عمر اس وقت ۱۴-۱۵ سال کی تھی۔ اس شعر کی یہ غزل "گلزارِ داغ" میں موجود ہے۔ کچھ شعر یہ ہیں۔ ؎

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا
نہ مزہ ہے دشمنی میں نہ ہے لطف دوستی میں
کوئی غیر غیر ہوتا کوئی یار یار ہوتا
یہ وہ دردِ دل نہیں ہے کہ ہو چارہ ساز کوئی
اگر ایک بار مٹتا تو ہزار بار ہوتا
ترے وعدے پر ستمگر ابھی اور صبر کرتے
اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

اگرچہ معلوم ہو چکا تھا کہ داغؔ کے اندر ایک زبردست فنکار چھپا ہوا ہے تاہم ابھی اس میں انفرادیت نہ تھی۔ جوہر کو اجالنے کے بعد کتنی منفرد اسلوب سے اسے قاری کے سامنے پیش کرنا بھی فنکارانہ صلاحیت چاہتا ہے۔ داغؔ سے پہلے دہلوی اساتذہ کی بھیڑ گزر چکی تھی جنہوں نے منزلِ شاعری کو جاتی ہوئی راہوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ داغؔ نے ان سب کو پیشِ نظر رکھا اور استاد جرأتؔ کے اسلوب سے جو بلحاظِ زبان و بیان ان سے قریب تر تھا، شہ پا کر ایک اپنا اسلوب ایجاد کیا جس نے انہیں داغؔ سے جہاں استاد داغ بنا دیا۔ تاہم انہیں جرأتؔ، کا مقلد کہنا غلط ہے کیونکہ جرأتؔ کے یہاں ذہنی عیاشی ہے مگر داغؔ صرف ذہنی آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے داغؔ

کے قلم سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ اور وہ ایک عام فہم، بامحاورہ زبان میں باریک مطالب ادا کرنے لگے۔ معاملہ بندی کو جس شوخی، چلبلے پن، صفائی اور روانی سے داغ نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصّہ ہے۔ ان کے شاگرد جن کی استادی کا سکّہ اردو شاعری میں نصف صدی تک چلتا رہا، زبان و بیان کے تو بادشاہ رہے مگر داغ نہ بن سکے۔ تجربے اور مشاہدے کے فقدان کی وجہ سے داغ کے استاد اور داغ کے شاگرد، تاثرات عشق کو کوئی حسین اور دلکش پیکر عطا نہ کر سکے۔

داغ نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، کبھی وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر، کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے، تاہم ان کا میدان، غزل اور صرف غزل ہے۔ اُن کا غزلوں کا پہلا غیر مطبوعہ ضخیم دیوان ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا تھا لیکن اس کا کچھ حصّہ بعد کے مطبوعہ دیوان میں یوں شامل ہو سکا کہ اس کے جو ایک ایک دو دو شعر یاد آتے گئے وہ لکھ لیے گئے اور اُن پر مزید شعر بڑھا کر غزلیں پوری کر لی گئیں۔ اس حصّے کی شناخت اب ممکن نہیں۔ داغ کے تیسرے مطبوعہ (۱۸۹۳ء) دیوان کے بعد ایک اور دیوان خوشخط لکھوا کر رکھا ہوا تھا کہ کسی نے اڑا لیا۔ جس کی بازیافت نہ ہو سکی۔ ایک اور دیوان بھی ابھی تک غیر مطبوعہ ہے جس میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں اور ان سب میں کوئی نہ کوئی محاورہ بندھا ہوا ہے۔ داغ کے پسماندگان میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہونے کی وجہ سے نظام حیدرآباد نے اُسے اپنے پاس منگوا لیا تھا اور آج تک وہیں کہیں ہے۔

جو دیوان طبع ہوئے وہ چار ہیں اور ایک ضمیمہ ہے۔ مختصر کوائف یہ ہیں (۱) گلزارِ داغ۔ یہ ۱۸۷۸ء میں چھپا تھا (۲) آفتابِ داغ۔

یہ ۱۳۰۲ھ (قبل از ۵ ستمبر ۱۸۸۵ء) میں طبع ہوا (۳) مہتاب داغ۔ اس کی تکمیل کتابت کی تاریخ ۲۳ دسمبر ۱۸۹۳ء ہے (۴) یادگارِ داغ۔ داغ کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۰۵ء میں چھپا تھا۔ یہ داغ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ متفرق کلام پر مشتمل ہے جو اُن کے شاگردوں کے پاس تھا اس کے بعد ایک مجموعہ کلام ضمیمہ یادگارِ داغ نام سے بھی ۱۱-۱۹۱۰ء میں شایع ہوا تھا۔ اسے یادگارِ داغ کی تتمیم کہنا چاہیے۔

داغ کے مطبوعہ دواوین سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے پہلے دو دیوانوں کے کلام کا رنگ کچھ اور ہے اور آخری دو دیوانوں کا رنگ کچھ اور۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا سبب آخرِ عمر میں جوشِ جوانی کا سرد ہوجانا ہے اور کہ شعراء کا کوئی محاذ نہ ہونے کے باعث جو دہلی اور رام پور میں در پیش تھا، داغ محض لفظوں اور محاوروں کی نشست و برخاست قائم کرنے کے لیے شعر کہتے تھے، اس لیے آخری دو دیوان ان کا وہ رنگ پیش نہیں کرتے جو اُن کے پہلے دو دیوانوں کا ہے۔ لیکن میرا خیال اس سے قدرے مختلف ہے۔ میری رائے میں ان کی زندگی میں کلکتہ کی طوائف منی بائی حجاب کے در آنے سے ان کا شعری رجحان سوقیانہ افکار کی تخلیق کی طرف ہو گیا تھا اور وہ کسی بھی طرح اس رکشش سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ تقابلی مقابلے سے یہ بات قطعاً ظاہر ہو جائے گی۔

پہلے گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ سے چند اشعار دیکھیے ؎

آخر کو عشق، کفر سے ایمان ہو گیا ۔ میں بُت پرستیوں سے مسلمان ہو گیا
رندانِ بے ریا کی ہے صحبت کسے نصیب ۔ زاہد بھی ہم میں بیٹھ کر انسان ہو گیا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں ؎ تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح ؎ یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

کیوں تغافل ہم سے ہے جشنِ عداوت ہی سہی ؎ کیا نگاہِ ناز میں اب قہر بھی کم ہو گیا

کل تک اس کی تلاش تھی لیکن ؎ آج سے اپنی جستجو مجھ کو

جب پاؤں تھکے تو جستجو کی ؎ جب دل نہ رہا تو آرزو کی
جب تم نہ ملے تو دردِ دل نے ؎ اُٹھ اُٹھ کے اجل کی جستجو کی

عشق کا لطف غم سے اُٹھتا ہے ؎ غم جو اُٹھتا ہے ہم سے اُٹھتا ہے
اس کی کافر نگہ کے اُٹھتے ہی ؎ شورِ دیر و حرم سے اُٹھتا ہے
کس سے اُٹھتا ہے صدمۂ الفت ؎ یہ ہمارے ہی دم سے اُٹھتا ہے

چند شعر آفتابِ داغ سے

ان کی صورت دیکھتے رہتے ہیں ہم ؎ دیکھیے کس وقت ہو ارشاد کیا
دل میں طاقت ہو تو سب کچھ ہو سکے ؎ عرش تک جاتی نہیں فریاد کیا

ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ ؎ مقدر بہت نارسا ہے کسی کا
ستم ہی کیے جاؤ ہم بھی ہیں حاضر ؎ ہمیں حوصلہ دیکھنا ہے کسی کا

غیر آیا ہے عیادت کو اگر آنے دو ؛ وہ بھی کمبخت مری جان کو رو جائے گا
آسماں ہو کہ زمانہ ہو غرض کوئی ہو ؛ تم جسے دوست بناؤ گے وہ ہو جائے گا

لگاتے ہیں دل اس سے اب ہار جیت ؛ اِدھر ہو گئی یا اُدھر ہو گئی
نگاہِ ستم میں کچھ ایجاد ہو ؛ کہ یہ تو پرانی نظر ہو گئی
شبِ وصل ایسی کھِلی چاندنی ؛ وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی
غمِ ہجر سے داغؔ تجھ کو نجات ؛ یقیں تھا نہ ہو گی، مگر ہو گئی

اب 'مہتابِ داغؔ' اور 'یادگارِ داغؔ' سے کچھ شعر ملاحظہ کیجیے۔ فرق صاف نظر آجائے گا ۔

مہتابِ داغؔ سے

سما گئیں اپنی نگاہوں میں ایسے ویسے کیا ؛ رقیب ہی سہی ہو آدمی ٹھکانے کا
تمہیں رقیب نے بھیجا کھلا ہوا پرچہ ؛ نہ تھا نصیب لفافہ بھی آدھ آنے کا

جوش پر اور قیامت کی جوانی آتی ؛ ہاتھ میرا جو ترے سینے پہ اکثر پھرتا
لطف تھا میں بھی تب وصل کہیں چھپ جاتا ؛ آدمی ان کا مری ٹوہ میں گھر گھر پھرتا

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں ؛ تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا

ان کی فرمائش نئی دن رات ہے ؛ اور تھوڑی سی مری اوقات ہے
بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمہیں ؛ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

جو مجھ پہ چشمِ لطف تھی اب غیر پر ہوئی ؛ دنیا کی طرح یہ بھی ادھر کی ادھر ہوئی
کرلیں گے حور کا بھی نظارہ دمِ اخیر ؛ دنیا کی تانک جھانک سے فرصت اگر ہوئی

یادگارِ داغؔ :-

آغوش میں لوں پاؤں پڑوں کھینچ لوں دامن ؛ ہاتھ آئے جو تجھ سا اسے چھوڑا نہیں جاتا
کہتا ہوں تو رکتی ہے زباں سامنے ان کے ؛ لکھتا ہوں اگر حال تو لکھا نہیں جاتا

فتنہ گر کیا مکان سے نکلا ؛ آسماں، آسمان سے نکلا
وہم آتے ہیں دیکھیے کیا ہو ؛ وہ اکیلا مکان سے نکلا
لو قیامت اب آئی وہ کافر ؛ بن بنا کر مکان سے نکلا

وہ دوپٹے کا سرکنا، وہ کسی کا کہنا ؛ آنکھیں پھوٹیں جو کوئی سینہ ہمارا دیکھے
پہلے تو شوق سے منگوائی ہماری تصویر ؛ پھینک کر پھر یہ کہا کوئی اسے کیا دیکھے

حوروں کی تمنا نہیں اے حضرت واعظ ؛ ہم تاک میں جس کی ہیں وہ ہے پردہ نشیں اور
اس وہم سے وہ داغؔ کو مرنے نہیں دیتے ؛ معشوق نہ مل جائے کہیں زیرِ زمیں اور

لیکن داغؔ مر گئے ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء بوقتِ شام۔ یقین ہے کہ انہیں زیرِ زمین کوئی اور معشوق بھی مل گیا ہوگا اور وہ ہوگا معشوقِ حقیقی، جس نے غائبانہ داغؔ کے دامن کو صرف بے پناہ مقبولیت ہی سے نہیں بلکہ دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کیے رکھا۔

داغیات کچھ مطالعے اور مشاہدے

(۱)

سوانح عمری داغ المعروف بہ آئینۂ داغ[1] از محمد نثار علی شہرت[2] - ۱۹۰۵ء

(ص ۸) "ایک وقت تھا کہ قلعہ معلیٰ کے دیوان عام میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا اور خاص خاص شعرا کی غزلیں بادشاہ سلامت الگ سُنا کرتے تھے ــــ عام

---

[1] داغ کے چند کوائف - ولادت ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء - چاندنی چوک، دہلی

۱۸۴۰ء - بعمر ۹ سال اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ساتھ پہلی بار رام پور گئے

۱۸۴۴ء - بعمر ۱۳ سال دلی واپس اور قلعہ معلیٰ میں پہنچے

اواخر ۱۸۵۷ء - بعمر ۲۶ سال پھر رام پور میں ... تاہم آٹھ نو سال کبھی دلی اور کبھی رام پور میں رہے

۱۸۶۶ء - میں مستقل طور پر رام پور میں ملازم - ۲۱ سال تک

۱۷ اپریل ۱۸۸۸ء - بعمر ۵۷ سال حیدر آباد آئے

۶ فروری ۱۸۹۱ء - بعمر ۶۰ سال دربار نظام سے توسل

۱۶ فروری ۱۹۰۵ء - حیدر آباد ہی میں انتقال

[2] شہرت ولد حسین علی فرحت شاگرد شاہ نصیر - خود اپنے والد اور مولانا تلق میرٹھی کے شاگرد تھے۔ خمخانۂ جاوید میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں لاہور میں انتقال کیا مگر یہ غلط ہے - استاذی قبلہ جوش ملسیانی نے مجھے بتایا تھا کہ شہرت ۱۹۲۲ء میں سید حفیظ الدین نخ (جن کے والد شہرت کے شاگرد تھے) کے ساتھ نکودر ضلع جالندھر آئے تھے - ۸۰ سال سے زائد عمر تھی - وہیں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے

لوگوں کو وہاں جانے کا حکم نہ تھا۔ ایک بار حضور بادشاہ سلامت نے یہ مصرعہ طرح کا اپنی طرف سے دیا تھا ؎

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے (ص ۹)

میری عمر اس زمانے میں بہت تھوڑی تھی لیکن کافیہ پڑھتا تھا۔ چونکہ والد ماجد اور برادر معظم کو شعر گوئی کا شوق تھا اس سبب سے میرا لگاؤ طبیعت کا بھی شعر کی طرف ہوگیا تھا۔ جب طبیعت پر زور دیتا جلد دس بیس شعر لکھ لیتا۔ لیکن میں نے کسی کو اطلاع نہ کی کہ میں شعر کہتا ہوں۔ طرح مذکور پر میں نے دس پندرہ شعر موزوں کر لئے تھے اور بادشاہ ذی جاہ کے مصرعے پر بھی میں نے مصرعہ چسپاں کیا تھا۔ میں نے ایک روز والد ماجد سے یہ گزارش کی کہ کوئی سبیل ایسی بھی نکل سکتی ہے کہ میں چند شعر بادشاہ جہاں پناہ کے حضور میں پڑھ سکوں۔ یہ بات سُن کر والد ماجد ہنسنے لگے اور فرمانے لگے کہ ہم کو پہلے شعر سناؤ تب ہم اس بات کا جواب دیں گے۔ میں نے اپنے شعر اُن کو سنائے جنہوں نے پسند کیے اور فرمایا کہ تم تو خوب کہہ لیتے ہو لیکن مجھ کو نہیں سناتے۔ برخوردار! بادشاہوں کے حضور پہونچنا آسان کام نہیں ہے اس کے علاوہ حضور میں پڑھنے کے لئے بڑی جرأت اور لیاقت چاہیئے اس لئے یہ خیال محال ہے کہ تم اپنے شعر بادشاہ کو سناؤ۔ جب میں نے دیکھا کہ یہاں تو دال نہیں گلتی معلوم ہوتی ہے تو میں حضرت قبلہ و کعبہ جناب نواب الہٰی بخش خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُنھوں نے شفقت بزرگانہ کی رو سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا، نثار علی آج تم کیوں کر آ گئے۔ میں نے گزارش کی تکلیف دینے کو حاضر ہوا ہوں۔ فرمانے لگے اپنے بچوں کے لیے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ میں نے کہا حال کی طرح پر میں نے بھی چند شعر لکھے ہیں۔ چاہتا

ہوں کہ میرے شعر بھی آپ حضور جہاں پناہ کو سنوا دیں۔ یہ بات سن کر آپ مسکرانے لگے اور یہ کہا تم کو ایسی جرأت ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں پڑھ سکو۔ میں نے کہا آپ ملاحظہ فرمالیں گے کہ کس طرح پڑھتا ہوں۔

(ص ۱۰) ارشاد ہوا پہلے ہمیں اپنے اشعار سناؤ، اس کے بعد تمہاری بات کا جواب دیں گے۔ میں نے بہت استقلال کے ساتھ ان کو اپنے اشعار سنائے۔ کہنے لگے شعر بھی تمہارے اچھے ہیں اور پڑھتے بھی تم خوب ہو۔ اچھا ہم جہاں پناں کے حضور میں تم کو پیش کر کے تمہارے اشعار سنوائیں گے۔ لیکن دیکھنا جھجکنا نہیں۔ میں نے التماس کی کہ آپ دیکھ لیں گے کہ میں کیا پڑھتا ہوں۔ میں نے جس طرح آپ کے سامنے اشعار پڑھے ہیں اس سے بھی بہتر پڑھوں گا۔ فرمایا، مشاعرے کے روز آجانا۔ میں نے کہا بہت بہتر۔ پھر میں چلا آیا اور کسی سے یہ حال ظاہر نہیں کیا اور مشاعرے کے روز نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارشاد ہوا۔ برخوردار موقع ہی اچھا ہے کیونکہ میاں داغ بھی آج حضور میں پیش ہوں گے ان کے بعد تمہاری باریابی ہو جاوے گی۔ چنانچہ نواب صاحب کچھ دیر بعد مجھ کو اندر لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ حضور جہاں پناہ گاؤ تکیے سے سر لگائے آرام میں ہیں اور ولی عہد کی گود میں آپ کے پائے مبارک ہیں اور سامنے چند شعرا موجود ہیں غرضکہ مجھ کو بھی ان کے عقب میں کھڑا کر دیا گیا۔ اوّل غالب صاحب نے غزل پڑھی۔ جنہوں نے ایک ایک شعر اس عمدگی کے ساتھ پڑھا کہ سننے والوں کو نقشِ تصویر بنا دیا۔ ان کے بعد ذوق صاحب نے اپنی غزل عمدہ طور پر پڑھی جو فی الواقع مرصّع تھی جس کا ایک ایک شعر لاجواب تھا ان کے بعد دو تین شاعروں نے اپنی غزلیں پڑھیں۔ ان کے بعد داغ صاحب پیش ہوئے۔ جو اوّل آداب بجالائے، جنہوں

نے غالباً دس یا بارہ اشعار پڑھے۔ جن کا ایک شعر اب تک مجھے یاد ہے ؎

میرے مغرور وہ جب آہ مری بے اثر دیکھی
کسی کا اِس طرح یارب نہ دُنیا میں بھرم نکلے

(ص ۱۱) جب داغ صاحب نے غزل تمام کی تو جہاں پناہ نے فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے۔ ان کے بعد میرا نمبر آیا۔ میں بھی آداب بجالایا۔ نواب صاحب ممدوح نے ہاتھ باندھ کر جہاں پناہ سے گزارش کی کہ برادر حسین علی فرحت کا لڑکا نثار علی شہرت حاضر ہے۔ اِس کو بچپن میں شعر گوئی کا شوق ہوگیا ہے۔ اگر حکم عالی ہو تو یہ بھی پڑھے۔ بادشاہ سلامت نے یہ بات سُن کر میری طرف بغور دیکھا اور فرمایا کہ یہ ننھی سی جان اور شعر کا شوق۔ ہاں پڑھو۔ میں پھر آداب بجالایا اور سات شعر میں نے پڑھے۔ جس میں سے میں نے ایک شعر میں طرح مذکور پر مصرعہ چسپاں کیا تھا۔ پس اُن میں کے دو اشعار مجھے یاد ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ؎

کہاں جائیں کدھر جائیں نہیں بنتی کہیں اپنی
کبھی ہم دَیر سے بھاگے کبھی کعبے سے ہم نکلے
بنایا دشمن اپنا دے کے دل اُس دشمنِ جاں کو
"کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے"

حضور جہاں پناہ نے جب میرے کُل اشعار سن لیے تو فرمایا اَلحَمدُ لِلّٰہ فرحت نے اپنے بچے کو عمدہ تعلیم دی ہے۔ پھر دربار برخاست ہوا۔ میں اپنے

۱؎ میرے سہوِ کاتب ہے، ہوئے چاہیے

گھر آیا۔ تمام حال والد ماجد سے کہہ سنایا۔ حضرت قبلہ دانتوں میں اُنگلی دے کر فرمانے لگے ۔۔۔۔۔۔۔۔ تم کو ایسی دلیری اور جرأت نہیں چاہیے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اِسی مشاعرے کی روداد 'جلوۂ داغ' مرتبہ احسن مارہروی میں دیکھیے۔ یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں چھپی تھی۔ جب کہ داغ ابھی زندہ تھے۔ روداد داغ ہی کے حوالے سے دہرائی گئی ہے۔ دیکھیے ص ۱۵

"ایک مرتبہ نجم الدولہ حضرت غالب مرحوم نے قلم نکلے، دم نکلے ہم نکلے اس ردیف وقافیہ میں بڑے زور کی غزل کہی۔ اتفاقاً یہی طرح قلعے کے مشاعرے میں دی گئی ۔۔۔۔۔۔۔ مگر چونکہ میرے پاس مصرعہ اسی شب کو پہنچا تھا، جس شب کو مشاعرہ تھا اس لیے اتنی مہلت نہ ملی کہ دو ایک روز پیشتر استاد کے پاس[1] جاکر اصلاح لیتا۔ مشاعرے کا وقت قریب تھا اور ابھی بادشاہ برآمد نہ ہوئے تھے کہ مَیں نے دیوانِ خاص میں وہ غزل استاد کو سنائی۔ اُنھوں نے غزل کو سُن کر فرمایا کہ خاصے شعر ہیں۔ اتنے میں بادشاہ تشریف لے آئے، اور مشاعرہ شروع ہوگیا۔ مَیں نے بھی اپنے نمبر سے غزل شروع کی۔ جب یہ شعر پڑھا۔

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی

کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سُن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا ۔۔۔۔۔۔۔"

۱۹۰۷ء میں داغ کی ایک اور سوانح عمری یادگارِ داغ کے نام سے شایع ہوئی۔ اسے داغ کے شاگرد اکبر علی خاں افسوس شاہ جہانپوری نے ترتیب دیا تھا۔ لیکن ابھی کتاب پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا اس میں لکھا ہے:

---

[1] ذوق دہلوی

(ص ۶) "ایک بادشاہی مشاعرہ میں جس میں بادشاہ بھی شریک تھے، مرزا (داغ) صاحب نے تنگیٔ وقت کے سبب سے بِلا اصلاحی غزل استاد کی اجازت سے پڑھی جس میں یہ شعر تھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سُن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔۔۔"

یادگارِ داغ کا مندرجۂ بالا بیان حقیقت میں جلوۂ داغ سے ماخوذ ہے اس لیے چنداں قابلِ اعتنا نہیں۔ لیکن آئینۂ داغ مصنفہ شہرت کا بیان یقیناً جلوۂ داغ کے بیان پر اضافہ ہے اور داغ کے بیان ہی کی طرح چشم دید بھی۔ لیکن اس میں بھی کئی تضادات در آئے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

(۱) ہمیں معلوم ہے کہ غالب کی طرحی غزل تتمۂ دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۱ رمضان ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۹ جون ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ رمضان ۹، جون سے شروع ہوا۔ ظاہر ہے کہ شاہی مشاعرہ اس سے پہلے (شاید ۳ جون جمعہ کے روز) منعقد ہوا ہوگا۔

(۲) شہرت کے سالِ ولادت کا علم نہیں۔ اگر جناب جوش ملسیانی کی بتائی ہوئی عمر (کہ ۱۹۲۲ء میں ۸۰ سال سے زائد عمر تھی) کو ۱۹۲۲ء میں ۸۴ سال مان لیا جائے تو شہرت کا سالِ ولادت ۱۸۳۸ء یا ۱۸۳۹ء قرار پاتا ہے اور جب انھوں نے شاہی مشاعرہ پڑھا ہوگا۔ ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہوگی۔ جب کہ داغ ۲۲ سال کے تھے۔

(۳) نواب الٰہی بخش خاں (معروف خسرِ غالب) جن کی مدد سے شہرت شاملِ مشاعرۂ شاہی ہو سکے تھے، ۱۸۲۶ء میں انتقال کر چکے تھے۔ جب شہرت، نواب الٰہی بخش خاں کی وفات کے ۱۲ یا ۱۳ برس بعد پیدا ہوئے تو وہ ان کی ذاتی مدد کے طالب کیونکر ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شہرت نواب الٰہی بخش خاں کے بیٹے مرزا علی بخش خاں (تقریباً ۱۸۰۱ء تا ۳۱، دسمبر ۱۸۶۲ء) کا نام لینا چاہتے ہوں، مگر ذہن

ہیں نواب الٰہی بخش خاں رہ گیا ہو۔ مگر علی بخش خاں کو نہ ہی شعر و شاعری سے واسطہ تھا اور نہ قلعے سے ان کا تعلق کہیں سے ظاہر ہوتا ہے۔

شہرت کے والد فرحت اور الٰہی بخش خاں معروف دونوں ہی شاہ نصیر کے شاگرد تھے اس لیے جب الٰہی بخش خاں (معروف) کا ذکر ہو گیا تو شہرت کے لیے یہ کہلوانا بھی لازم آیا کہ معروف نے بادشاہ سے گزارش کی "کہ برادر حسین علی فرحت کا لڑکا نثار علی شہرت حاضر ہے۔"

ظاہر ہے کہ (۳) میں کہی گئی باتیں نہ صرف محلِ نظر ہیں بلکہ شہرت کی اختراعیں ہیں۔

(۴) شہرت کے بیان کے مطابق مصرع طرح یہ تھا جو بادشاہ نے خود اپنی طرف سے دیا تھا[1]

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

اس پر شہرت کا گرہ موجود ہے لیکن خود بادشاہ ظفر نے اس مصرع کو نہیں اپنایا۔ ظفر کے دیوان چہارم (مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۷ء) کے ص ۱۴۷ پر اس زمین میں ۱۱ شعر کی غزل موجود ہے مگر اس میں مصرع طرح والا شعر نہیں۔ شاید مصرع طرح بادشاہ کا طبع زاد نہ تھا۔

(۵) شہرت کہتے ہیں "اُن (غالب) کے بعد ذوق صاحب نے اپنی غزل عمدہ طور پر پڑھی جو فی الواقع مرتبے تھی جس کا ایک ایک شعر لاجواب تھا۔" جلوۂ داغ اس بارے میں خاموش ہے۔ ذوق کے دیوان اور کلیات میں بھی اس زمین میں کوئی غزل نہیں۔ کیا وہ ضائع ہوئی؟ کیا انھوں نے غیر طرحی کلام سنایا تھا؟ (اگلے صفحے پر حاشیہ ۲ ملاحظہ فرمایئے)

---

[1] جلوۂ داغ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنی غزل مصرع طرح کے اعلان سے پہلے ہی کہہ لی تھی جو بہت زور دار تھی۔ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے اسی غزل کو مدِ نظر رکھ کر مصرع طرح دیا ہو اور غالب نے اپنی وہی غزل سنائی ہو۔

(۶) جلوۂ داغ میں درج ہے۔

"جب (داغ نے) یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ مری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

تو یہ شعر سن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے برعکس شہرت لکھتے ہیں (اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جلوۂ داغ شہرت کی کتاب سے تین سال پہلے چھپ چکی تھی) کہ داغ نے دس بارہ شعر کی غزل پڑھی جس کا ایک شعر اب تک مجھے یاد ہے اور وہ شعر جلوۂ داغ میں درج شدہ شعر ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ:

"جب داغ صاحب نے غزل تمام کی تو جہاں پناہ نے فرمایا۔ کیا اچھی طبیعت پائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بلا کر پیشانی پر بوسہ دینے اور صرف یہ داد دینے کہ "کیا اچھی طبیعت پائی ہے" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تاہم اوپر کے بیانات کے پیشِ نظر ترجیح داغ ہی کے بیان کو دی جائے گی۔

البتہ غالب کی معرکۃ الآرا غزل کی داد دینے میں داغ اور شہرت یکساں فراخدل ہیں۔

---

۱ (ص ۷) "جب آپ کی (داغ) عمر بارہ یا تیرہ برس کی تھی مشاعرے کی طرح پر آپ نے غزل لکھی جس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

---

۱ دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد کے ص ۱۲۵ پر لکھا ہے کہ ذوق "جب حضور (شاہ ظفر) میں غزل مشاعرے کے لیے کہتے تھے تو اپنی غزل اس طرح میں نہ کہتے"۔

اس شعر کی دھوم تمام قلعہ اور شہر میں ہو گئی تھی اور بچے سے لے کر بوڑھے تک۔۔ کی زبان پر یہ شعر تھا۔ مشاعرے میں اس کی داد لوان سا شاعر تھا جس نے نہیں دی۔ کئی کئی بار یہ شعر شاعروں نے آپ سے پڑھوایا اور الفاظ جزاک اللہ اور سبحان اللہ سے تمام مشاعرہ کئی بار گونج گیا تھا۔ میں نے اُن دنوں میں سُنا تھا کہ جب مرزا غالب صاحب نے آپ کا یہ شعر سنا تو وجد میں آ گئے تھے۔ بار بار اس شعر کو پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے اور جو کوئی اُن کے پاس آتا تھا اس کو یہ شعر سناتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ کیا شعر لکھا ہے۔ مجھ کو تڑپا دیا ہے۔ یہ مضمون نہ کہیں سُنا اور نہ کہیں دیکھا ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ "

۲ (ص ۴۳) " ذوق صاحب اپنی زندگی میں عمدہ اردو محاورات اپنے اشعار میں لکھتے رہے لیکن اُن کو اپنے خیالِ مذکورہ میں عمدہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک تو اس سبب سے کہ اس کوشش کو بہت عرصہ نہیں گزرا تھا، دوسرے ان کے سامنے دوسرے ہم عصر موجود تھے جو فارسی کے حمایتی فارسی کے والہ و شیدا تھے وہ کون "جناب مرزا غالب صاحب" جن کے اشعار میں برائے نام اردو ہے ورنہ فارسی ہی فارسی بھری ہوئی ہے ملاحظہ کیجیے ؎

ہوا ہے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ ہنگام بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

تمام شعر میں لفظ آیا اردو ہے ورنہ سب الفاظ فارسی ہیں اگر آیا کی جگہ آمد لکھ دیا جاتا تو فارسی کا ہی شعر ہو جاتا۔ لیکن اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ جناب مرزا غالب نے بھی آخری عمر میں ذوق صاحب کی رائے مذکور کو مانا تھا۔ بعد غدر جب انہوں نے دیکھا کہ اُردو کا پالنے اور تعلیم

دینے والا کوئی نہیں رہا اور یہ یتیم ہوگئی ہے پس بہتر یہ ہے کہ جو خوبیاں اس میں ہیں اُن کو شایع کیا جاوے تاکہ یہ زندگی پائے۔ انھوں نے عودِ ہندی شایع کی جس میں اُردو کے شُستہ محاورے موجود ہیں۔"

۳ "ایک روز میں مرزا غالب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کھانا نوشؔ فرما رہے تھے۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا آپ نے ایک رنگ۲ طرح میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے۔ چونکہ رمضان کا مہینا تھا اور مجھے روزہ تھا۔ میں نے اُس رنگ۳ طرح کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں "ہاں آپ مولوی ہوگئے ہیں"۔ میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے۔ جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اُس میں کچھ بنانے لگے غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی (ص ۳۸) جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں تو (ص ۳۸) فرمانے لگے اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دیے گئے ہیں اس لیے انھیں نکال رہا ہوں۔ اور شُستہ اُردو الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں۔ میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے، فرمانے لگے۔ وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں۔ شہرت بعض شعر تو ایسے ادق میری قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنے خود نہیں بیان کر سکتا۔ پھر فرمانے لگے دہلی والوں کی جو اُردو ہے (جس کو مُشک اور عنبر کہنا چاہیے) اُس کو

۱۔ "کھانا کیا تھا سامنے چھوٹے سے گلاس میں ماءاللحم رکھا ہوا تھا"

۲، ۳۔ اصل زنگترہ

ہی اشعار میں لکھنا چاہیئے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے۔
میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی۔ داغ کی اردو کیسی ہے فرمانے لگے۔
ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی۔ ذوق نے تو اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔
داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔۔۔۔۔۔"

یہ درست ہے کہ غالب، داغ کے مداح رہے ہیں۔ تمکین کاظمی (نواب مرزا خاں داغ۔ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔ ص۔ ۴۰) نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر داغ کو ابتداً ذوق کا تلمذ اور اس کے بعد غالب کی ہم نشینی نصیب نہ ہوتی تو وہ داغ نہ بن سکتے تھے"۔ تاہم شہرت کے بیان کردہ یہ لفظ" ذوق نے تو اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"۔ غالب کے نہیں معلوم ہوتے۔ غالب نے تعریف اپنے لفظوں میں کی ہوگی، یہ اندازِ بیان غالب کا نہیں بلکہ خود شہرت کا ہے۔ اسی چھوٹی سی کتاب میں شہرت نے یہ انداز کئی جگہ اپنایا ہے۔ مثلاً

"مولوی غیاث الدین صاحب مصنفہ کشف[۱] اللغات نے بھی کئی سال تک آپ کو اعلیٰ تعلیم دی ہے"۔

"... جو نہ فقط ان کو تعلیم دیتے تھے بلکہ .... آدابِ شاہی سکھاتے تھے ..."

"داغ کو بھی تعلیم .... دلائی گئی تھی"۔

"فرحت نے اپنے بچے کو عمدہ تعلیم دی ہے"۔

"انہوں نے دیکھا کہ اردو کا پالنے اور تعلیم دینے والا کوئی نہیں رہا"۔

"نہ فقط اردو پیدا ہوئی بلکہ بڑھی اور پلی"۔

"کرنا تھا کوچ دہر سے اردو کو پال کر۔
ہندوستان کا رہ گیا ارمان ہائے ہائے"   وغیرہ وغیرہ۔

---

[۱] مولوی غیاث الدین (بن جلال الدین رام پوری) غیاث اللغات (۱۲۴۲ھ) کے مؤلف ہیں۔ کشف اللغات ۹۳۳ ہجری میں عبدالرحیم بن احمد سور نے تالیف کی تھی۔ شہرت کو مغالطہ ہوا۔

جلوۂ داغ ۔ از احسن مارہروی مطبوعہ ۱۹۰۲ء

فیض کا ایک مشہور شعر ہے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

دوسرے مصرعے میں بات قطعاً حشو ہے فیض زبان و بیان کے معاملات میں خاصے کچے تھے اور یہ خامیاں اُن کے کلام سے نصف صدی سے زیادہ کی ریاضت کے باوجود رفع نہ ہو سکیں (یا انہوں نے دانستہ اس طرف توجہ نہ کی) ۔ اسی انداز کا ایک شعر داغ کا دیکھیے اور پھر دونوں کا فرق ملاحظہ کیجیے اور داغ کے کلام کی چُستی کی داد دیجیے ؎

(جلوۂ داغ ص ۶۶) انہیں جس بات سے تھی سخت نفرت
وہی بے ساختہ نکلی زباں سے

یہاں استاد نے ہدایت نامے میں بالکل درست فرمایا ہے ؎

(جلوۂ داغ ص ۱۴۳) شعر میں حشو و زوائد بھی بُرے ہوتے ہیں
ایسی بھرتی کو، سمجھتے نہیں شاعر اچھا

اسی ہدایت نامے میں دو شعر عروض کے بارے میں بھی نہایت کارآمد ہیں ؎

شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اس کی
گر عروض اُس نے پڑھا وہ ہے سخنور دانا

یعنی شاعر کو عروض سیکھنا چاہیئے کیونکہ شعر کہنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے ۔ مگر شعر کہنے کے لیے کتنا عروض سیکھنا ضروری ہے ؟

چند بحریں متعارف ہیں فقط اردو میں
فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان سے سوا

فقط اتنا ہی یعنی چند ہی بحریں ہیں جو اردو میں متعارف ہیں ۔ اردو کے شاعر کے

داغیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے

(۲)

(ص ۶۱) " سائل صاحب اور میں) باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلیے آپکے دادا جان (غالب) کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ .... چونسٹھ کھمبا کے پاس .... احاطے میں .... (سائل صاحب) مختلف قبروں کی نشاندہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف (مرزا الٰہی بخش خسرِ غالب) کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے (غالب کے برادرِ نسبتی) علی بخش خاں کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رام پوری) ہیں ----------------- "

افسوس کہ آج تک معروف کی بیوی (غالب کی ساس) کے کوائف معلوم نہیں ہو سکے۔ شاید سائل صاحب کچھ بتا سکتے۔

(ص ۷۴) "کوئی گھنٹہ بھر میں دوست احباب جمع ہونا شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو خضر میرزا مرحوم تھے۔

دوسرے ظہیر دہلوی کے نواسے سید اشتیاق حسین شوق۔ خضر میرزا، میرزا زین العابدین خاں عارف کے بھتیجے اور سائل صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ سائل، نواب ضیاء الدین خاں کے پرپوتے تھے اور خضر میرزا ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے کے بیٹے، گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدِّ اعلیٰ ایک تھے۔ خضر میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد اب یہیں دہلی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے اور سارا وقت عبادت میں گذارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی[۱]۔ لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے بیسیوں ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ باوجود پیرانہ سالی اور زہد کے انہیں غیر شستہ بلکہ عریاں لطیفے کہنے میں باک نہیں تھا۔ ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں جو نسبتاً کم عریاں ہے۔

ایک مولوی صاحب تھے۔ نماز کا وقت آیا تو مسجد میں تشریف لائے۔ پھر مسواک کی۔ پھر لوٹا ہاتھوں میں لیے جائے ضرور میں گئے اور واپس آکر وضو کرنے لگے۔ ابھی وضو ختم نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے، بولے کہ

---

[۱] یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس کا ہے۔ اس طرح خضر میرزا کی ولادت ۱۸۵۶ء کے لگ بھگ متعین کی جا سکتی ہے۔ گویا غالب کے انتقال کے وقت عمر ۱۲-۱۳ سال ہو گی۔ حکیم امجد علی خاں، حافظ ویران شاگردِ ذوق کے نواسے کا انتقال ۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ وہ بھی اس محفل میں شریک تھے۔

برادر جاوداں مانی بریں نفضل سخندانی — بہ نالِ لطفِ سبحانی از فرخ ایں دعا آمد"

سید احمد شفیع نیر فرید آبادی (۱۸۶۷ء تا ۱۹۰۶ء) نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے داماد اور نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کے بہنوئی تھے۔ ان کی بیگم کا نام رضیہ سلطان بیگم تھا۔ شادی ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔ فرخ مرزا (ولادت ۲۶ جنوری ۱۸۶۰ء) اپنے والد نواب علائی کی وفات (۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء) کے بعد والیِ لوہارو مقرر ہوئے تھے۔ سید احمد شفیع ۔ نیر ادیب اور شاعر تھے۔ انہوں نے کسی عید الفطر پر فارسی میں ایک قطعۂ تہنیت فرخ مرزا کو بھیجا۔ جس کے جواب میں نواب فرخ مرزا نے مندرجۂ بالا قطعہ نیر کو لکھا۔ جس میں دو جگہ فرخ تخلص آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی شعر کہتے تھے لیکن "خاندانِ لوہارو کے شعرا" میں ان کو شامل نہیں کیا گیا۔

(ب) لوہارو والوں نے ایک عرصے تک نواب مرزا خاں داغ کو نواب احمد بخش خاں کا پوتا اور نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا نہیں مانا۔ لیکن اب تو سب مانتے ہیں۔ پھر ایسے جید اور عہد ساز شاعر کو "خاندانِ لوہارو کے شعرا" میں شامل نہ کرنا سخت ناانصافی ہے۔ اگرچہ اس شمولیت سے خود خاندانِ لوہارو کی شان میں اضافہ ہوتا۔

(ج) لوہارو مہاراجہ بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنی طرف سے نواب احمد بخش خاں کو عطیہ دیا تھا۔ وہیں سے خاندانِ لوہارو کی بنیاد پڑی۔ لہٰذا خاندانِ لوہارو کے شعراء میں صرف وہی شامل کیے جا سکتے ہیں جو نواب احمد بخش خاں کی اولادِ نرینہ[1] سے ہیں۔ بیٹیوں کو اسی صورت میں شامل کیا جا سکتا ہے جبکہ

---

[1] نواب مرزا الٰہی بخش خاں معروف اُن کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا بھی سوائے اس رشتے کے لوہارو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ معروف کا ریاستِ لوہارو کی طرف سے کوئی وظیفہ بحیثیت وارث مقرر نہ تھا۔ البتہ انہیں خاندانِ لوہارو میں شمار کرنے میں اس لیے تامل نہیں کہ نواب احمد بخش خاں اور معروف کا تعلق بہت گہرا تھا اور وہ معروف کو خود سے الگ نہیں سمجھتے تھے

وہ خود شعر کہتی ہوں۔ ان کے شوہر یا اولاد خاندانِ لوہارو کے رکن نہیں کہے جا سکتے۔

"خاندانِ لوہارو کے شعرا" میں کُل ۲۱ شاعروں کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر ان میں ۸ شاعر خاندانِ لوہارو سے نہیں ہیں، اُن کے نام یہ ہیں :

(۱) حُسین علی خاں شاداں
(۲) زین العابدین خاں عارف
(۳) باقر علی خاں، کامل
(۴) غلام حُسین خاں مسرور
(۵) غلام حسن خاں محو
(۶) مطلبی فرید آبادی
(۷) احمد شفیع نیر فرید آبادی
(۸) سیّد ہاشمی فرید آبادی

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ خود حمیدہ سلطان احمد صاحبہ کا بھی خاندانِ لوہارو سے کوئی تعلق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اُن کی نانی بگا بیگم، نواب ضیاء الدین احمد خاں کی بیٹی تھیں۔ اس طرح غالب سے بھی کوئی رشتہ نہیں۔ سوائے اس کے کہ حمیدہ سلطان بیگم صاحبہ کے یتیم ناناکی غالب نے پرورش و پرداخت کی تھی۔ مگر نانا مرزا باقر علی خاں کامل اور نانا کے والد زین العابدین خاں عارف کو غالب نے کبھی گود نہیں لیا تھا۔

ماہنامہ "پیامِ یار" لکھنؤ۔ متفرق شمارے جنوری ۱۸۸۸ء تا جنوری ۱۸۹۵ء

منشی نثار احمد نثار لکھنوی مرحوم چوک لکھنؤ میں عطر کی دکان کرتے تھے۔ خود شاعر

گلزارِ داغ مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں شامل ہیں اور غزل ۶، ۷، ۱۱، ۱۲، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، آفتابِ داغ مطبوعہ ۸۵/۱۸۸۴ء میں موجود ہیں۔ باقی سب کلام مہتابِ داغ مطبوعہ ۱۸۹۳ء (؟) میں ہے گویا واقعی طرح پر کہا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۴ غزلیں پہلے ہی سے گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ میں موجود تھیں اور طرح کے اعلان ہونے پر وہی غزلیں (جن کے اشعار دیوان میں شامل اشعار سے عموماً کم ہیں) پیامِ یار کو برائے اشاعت فراہم کر دی گئیں۔ داغ ایسا کر لیا کرتے تھے۔ جب احسن مارہروی مرحوم نے اپنے گلدستے کے لیے طرحی غزل مانگی تو داغ نے لکھا (زبانِ داغ ص ۵۰)

"مہتابِ داغ کو ملاحظہ کرو، میری غزل اس زمین میں ہے ...."

گویا وہاں سے لے کر گلدستے میں شائع کر دو یہی عمل انہوں نے یہاں بھی روا رکھا۔ غزل ۱۳ ؎

اللہ رے تلوّن ابھی کیا تھے، ابھی کیا ہو، کو طرحی غزل بنانے میں داغ نے خاصی ایڈیٹنگ سے کام لیا ہے۔ گلزارِ داغ میں اس زمین میں دو طویل غزلیں ہیں، اُنھوں نے دونوں میں سے اشعار لے کر ایک غزل تیّار کر لی اور پیامِ یار میں چھپوا دی۔ اس کے کل شعر ۲۶ ہیں ۱۳ شعر غزل اوّل سے اور ۱۳ ہی غزل دوّم سے، پانچ مطلع ہیں۔ پہلے تین غزل اوّل سے لیے گئے ہیں اور دو غزلِ دوّم سے، مقطع غزلِ اوّل کا ہے۔

وہ غزلیں جو طرح پر کہی گئی تھیں جب مہتابِ داغ میں داخل کی گئیں تو کچھ نہ کچھ نظرِ ثانی بھی ضروری تھی۔ اگرچہ داغ کا کلام پہلی ہی نظر میں نہایت پختہ اور استادانہ ہوتا تھا اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہ ہوتی تھی، پھر بھی کہیں کہیں نہایت معمولی پھیر بدل ہوا ہے جو لطف سے خالی نہیں۔ چند تراہیم ملاحظہ کیجیے ؎

پیامِ یار	مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال	دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا
ترمیم		.... شکوے ....
پیامِ یار	اب دل ہے مقام بے بسی کا	یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا
ترمیم	.... کسی ..	

پیام یار	عیش و عشرت میں اُدھر ہے تو مصیبت میں اِدھر	ایک ہو کر کبھی اُس کا ہے کبھی دل اپنا
ترمیم		۔۔۔۔۔ ان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔
پیام یار	مرادیں مانگ رہا ہوں قضا کے آنے کی	بری گھڑی تھی دلِ مبتلا کے آنے کی
ترمیم	۔۔۔۔ مان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	
پیام یار	ایسے لینے سے تو ہے جان کا دینا بہتر	کیا جیے گر جیے احسان کسی کا لے کر
ترمیم	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا	
پیام یار	دنیا ہی میں ملتی ہے اُسے دوزخ و جنت	انسان نہ زرا سیر کرے گھر سے نکل کر
ترمیم	۔۔۔۔ ملتے ہیں ۔۔۔۔۔۔	
پیام یار	بے در بدر ہوئے نہ نکلتا تھا یہ غبار	آج اُن سے صاف صاف مری برملا ہوئی
ترمیم	۔۔۔۔۔۔۔ نہ نکلتا کبھی غبار	
پیام یار	دیکھا دل ان کا غیروں نے سینے پہ رکھ کے ہاتھ	وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں
ترمیم	۔۔۔۔ غیر ۔۔۔۔۔۔	
پیام یار	مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے	چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے
ترمیم		۔۔۔ گئے ۔۔۔۔۔۔۔
پیام یار	مری التجا پر بگڑ کر وہ بولے	نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا
ترمیم	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہنا	
پیام یار	وہ نیم وعدہ کر کے فراموش ہو گئے	امیدوار ہوش سے بے ہوش ہو گئے
ترمیم	۔۔۔۔۔۔ جو خاموش ۔۔۔۔	

غزل ۲۶ کے، جس کا مطلع ہے سے

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا ۔۔۔ وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا

کل ۳ شعر پیام یار میں شائع ہوئے تھے اگرچہ مہتاب داغ میں اس غزل کے ۸ اشعار ہیں ۔

پیامِ یار میں شائع شدہ غزل کا یہ شعر مہتاب داغ میں نہیں ہے ۔

اور مقطع یہ ہے ؎

آبِ کوثر، جوشؔ! ہو جس پر فدا
وہ مرا اشکِ ندامت کوش ہے

آخرِ ۱۹۴۶ء میں جب میں رسالہ داستان (جالندھر) کی اشاعت کے سلسلے میں جوشؔ صاحب کی خدمت میں پہنچا تو اُنھوں نے مجھے اپنے پہلے مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" کی ایک جلد عنایت فرمائی۔ میں نے تخلص کی رعایت سے کتاب کے نام "بادۂ سرجوش" کی داد دی تو اُنھوں نے فرمایا کہ "یہ نام حقیقت میں اُن کے استاد حضرتِ داغؔ کا دیا ہوا ہے۔ جب میں نے یہ غزل (جو اصلاً ۸ شعر کی تھی) اصلاح کے لیے بھیجی تو اس کا مقطع یہ تھا ؎

اک جہاں ہو جس کا مشتاقِ جمال
جوشؔ! حیرت ہے کہ وہ روپوش ہے

حضرت داغؔ نے لفظ جوشؔ قلم زد کر کے اس پر سخت بنا دیا اور کہ وہ کو وہ کیوں سے بدل دیا یعنی سخت حیرت ہے وہ کیوں روپوش ہے مگر غزل مقطعے سے محروم ہو گئی۔ چنانچہ استاد نے اصل مقطعے کے نیچے، شاید ازرہِ شوخی، اس مقطعے کا اضافہ کر دیا ؎

نشۂ آورِ سخن لو کیا عجب
جوشؔ بھی تو بادۂ سرجوش ہے"

بعد میں جوشؔ صاحب نے اس مقطع کی جگہ یہ نیا مقطع کہہ کر غزل میں داخل کیا ؎

آبِ کوثر جوشؔ ہو جس پر فدا
وہ مرا اشکِ ندامت کوش ہے

مگر اپنے استاد کے دیے ہوئے قافیے "بادۂ سرجوش" کو سر آنکھوں سے لگایا اور پہلے مجموعۂ کلام کا عنوان بنا کر اُس سے اپنے کلام کو ممتاز کیا۔

داغیات۔ کچھ مطالعے اور مشاہدے

(۳)

فسانۂ غالب از مالک رام۔ جنوری ۱۹۷۷ء

(ص ۱۰۴ حاشیہ)

"داغ کے کسی سوانح نگار نے نواب شمس الدین احمد خاں اور چھوٹی بیگم (والدۂ داغ) کے نکاح کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ سب نے داغ کی ولدیت کی صراحت ضرور کی ہے۔ نساخ نے سرے سے باپ کا نام ہی نہیں لیا اور لکھ دیا۔ ولد چھوٹی بیگم (سخن شعرا، ص ۱۵۷) ——————"

نساخ نے تذکرہ سخن شعرا ۱۲۹۱ھ میں شائع کیا تھا۔ عبارت بسلسلۂ داغ یہ ہے:

"داغ تخلص نواب مرزا داغ دہلوی ولد چھوٹی بیگم، شاگرد شیخ محمد ابراہیم ذوق ملازم نواب رام پور۔ راقم نے اس شخص کو دہلی میں دیکھا ہے۔ اچھی طبیعت پائی ہے ——————"

اس تذکرے کی اشاعت کے وقت داغ تقریباً ۴۴ سال کے تھے اور اس وقت تک نساخ نے داغ کو محض دیکھا تھا مگر اس تذکرے کے چند سال بعد (شاید آٹھ سال بعد) نساخ نے ایک اور تذکرے "تذکرۃ المعاصرین" کی بنیاد ڈالی۔ تب

تک نسّاخ، داؔغ کو اپنے معزّز دوستوں میں شمار کرنے لگے تھے۔ اس میں داؔغ کو نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا ہی کہا گیا ہے۔

رسالہ سفینہ کے خصوصی شمارے بابت جنوری / اپریل ۱۹۸۷ء (نمبر ۲۷-۲۸) میں تذکرۃ المعاصرین کا (جو نسّاخ کے انتقال کے وقت چھپ رہا تھا اور ادھورا رہ گیا تھا) اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اُس میں داؔغ کا ضروری حال ملاحظہ فرمایئے:

"داؔغ نواب مرزا خاں دہلوی ..... نواب شمس الدین احمد خاں مرحوم ابن نواب احمد بخش خاں مرحوم رئیس فیروز پور جھرکہ، لوہارو کے بیٹے۔ دہلی کے مشہور شعرا میں سے ہیں..... استادِ مسلّم الثبوت ہیں..... اُن کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہوگی۔ راقم کے معزز دوستوں میں ہیں۔ — — — — — — — — —"

گویا سخن شعرا کی خطا کی تلافی تذکرۃ المعاصرین میں کر دی گئی تھی، جو شاید "ذکرِ غالب" کے پانچویں ایڈیشن تک منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

"مثنوی انبساط و انتشار" نواب امین الدین احمد خاں امیؔن مطبوعہ دہلی ۱۹۷۳ء

(ص ۵۷) "استفسارِ فرخی بابت معنی بسمل" داد لٹے غالبؔ سے"۔

ابھی فرّخی کا تھا کم سن و سال ؛ کہ واکد کو ان کے ہوا یہ خیال
ہو تعلیم کا ان کی وہ اہتمام ؛ کہ روشن ادیبوں میں ہو ان کا نام

انہیں پھر وہ ہمراہ لانے لگے
ادب کی مجالس دکھانے لگے

۱؎ نواب سر امیر الدین احمد خاں عرف فرخ مرزا

۲؎ نواب علاء الدین احمد خاں علائی، شاگردِ غالبؔ

صدارت میں غالبؔ کی اک مرتبہ ؛ ہوئی مجلسِ شعر آراستہ
علائیؔ بھی بیٹے کو لائے وہاں ؛ جہاں جمع تھے سارے اہلِ زباں
بہت شاعروں نے سنایا کلام ؛ جو تھے داد پاتے وہ کرتے سلام

یہاں لفظِ "بسمل" پہ تکرار تھی
ہے کیا چیز سمجھے نہ یہ فرخیؔ

ہوئی ختم مجلس نہ کوئی رہا ؛ وہاں گھر کے افراد کے ماسوا
یہ غالبؔ سے پوچھا جو موقع ملا ؛ بڑے دادا کیا شے ہے "بسمل" بھلا
ہنسے ہنس کے غالبؔ نے پھر یہ کہا ؛ ترے چھوٹے دادا ہیں اس کی دوا
یہ پوچھ ان سے یا جا انہیں دیکھ لے ؛ وہ بتلائیں گے اس کے معنی تجھے
سنا جب علائیؔ نے جز بز ہوئے ؛ اٹھا بیٹے کو ان سے کہنے لگے
چچا جان بچے سے یہ کیا کہا ؛ کوئی اور معنیٰ اسے دیں بتا
سنا یہ تو غالبؔ نے ہنس کر کہا ؛ نہ سمجھیں گے نیرؔ اسے کچھ برا
تمہارا یہ بچہ جو ہے جانشیں ؛ اسے علم درکار ہے بہتریں

انہیں باتوں میں ہوگا علیم
اسی طور ہوتے ہیں ناداں فہیم

غرض ایک دن صبح کو فرخیؔ ؛ گئے، اپنے دادا کی دی حاضری
نہایت ادب سے بصد احترام ؛ کیا چھوٹے داد کو جھک کر سلام

۱؎ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ و رخشاںؔ، شاگردِ غالبؔ۔ علائیؔ کے سگے چچا
۲؎ غالبؔ۔ امراؤ بیگم بنتِ الٰہی بخش خاں معروفؔ کے رشتے سے
۳؎ ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ و رخشاںؔ
۴؎ ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ و رخشاںؔ

گلے سے لگا کر بہت خوش ہوئے ٭ دعائیں ترقی کی دینے لگے

لگے کہنے ہم نے سنا ہے یہ حال ٭ کہ آؤ گے تم پوچھنے اک سوال

کہا تم سے دادائے غالب نے کیا ٭ دیا پوتے[1] نے واقعہ سب سنا

کہا سُن لو دادا کے لختِ جگر ٭ تمہیں آپ ہو جائے گی یہ خبر

حقیقت میں بسمل نہیں کوئی شے ٭ مزاحاً بڑھائی ہے غالب نے لے

جسے کہیے زخمی ہے "بسمل" وہی

سنایا پھر اک قصۂ واجبی

کہا دن ہوئے کچھ کہ دلی میں تھیں ٭ گھرانے کی اک، تین بہنیں حسین

تھا زہرہ جمالوں میں اُن کا شمار ٭ جمال ان کا دل کش تھا آئینہ دار

کٹی عمر دو کی تو بس سرسری ٭ مگر تیسری نامور ہو گئی

ہوئے پانچ خوش بخت اس کے اسیر

ملا رتبۂ بسملی اسے صغیر

کہا فرخی نے کہ پھر کیا ہوا ٭ کہا بیٹا اس کو خدا نے دیا

کہا بیٹا ان میں سے کس کا وہ تھا ٭ کہا جس کو لے باپ اپنا بنا

کہا کان میں پھر بہ آہستگی

نہیں باپ ایسوں کا ہوتا کوئی[2]

"

---

[1] فرخی (فرخ مرزا) [2] لطائفِ غالب (از مسٹر ایم. اے شاہ مطبوعہ لاہور ۱۹۳۸ء ص ۳۱) میں اس طرح آیا ہے" ایک دفعہ فرخ مرزا نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ حضرت بسمل کے کیا معنی ہیں۔ اس وقت مرزا صاحب ایک گاؤ تکیہ پر سر رکھے اور ٹانگیں اکٹھی کیے ہوئے کسی قدر اوندھے لیٹے تھے۔ کہنے لگے جس حالت میں اس وقت میں ہوں۔ سمجھ لو کہ اس حالت والے کو بسمل کہتے ہیں" تاہم معتبر روایت وہی ہے جو مثنوی کے حوالے سے بیان ہے۔

اس سے پہلے کہ اس منظوم قصّے پر غور کر کے اس کے مرکزی کردار کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ فرخی (نواب سر امیر الدین احمد عرف فرخ مرزا) اور غالبؔ کے متعلق پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

فخر الدولہ نواب سر امیر الدین احمد خان عرف فرخ مرزا (فرخی) کی تاریخ ولادت ۲۶ جنوری ۱۸۶۰ء ہے[1]۔ نواب امین الدین احمد خاں کے پوتے اور نواب علاء الدین احمد خان علائیؔ کے بیٹے تھے۔ نواب علائیؔ انہیں ۲۰ جون (۱۸۶۸ء)[2] کو اپنے ساتھ لے کر غالبؔ کے مکان پر حاضر ہوئے۔ غالبؔ ۲۲ جون (۱۸۶۸ء) کے خط بنام امین الدین احمد خاں لکھتے ہیں۔

"....... ایک کو ملکِ غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا آیا، اس کا باپ (علائیؔ) بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے کون ہو؟ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ "حضرت آپ میرے دادا ہیں اور میں آپ کا پوتا ہوں"۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی ہے۔ کہا جناب عالی آکا جان (والد) کی تنخواہ آگئی ہے میری نہیں آئی۔ میں نے کہا، تو لوہارو جائے تو تنخواہ پائے۔ کہا، "حضرت میں تو آکا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو۔ اپنی حکومت کو چھوڑ کر دلّی کی رعیّت میں کیوں مل گئے"۔ سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبعِ سلیم۔ میں

۱۔ انتقال ۱۹ جنوری ۱۹۳۷ء

۲۔ غالبؔ نے سال نہیں لکھا، لیکن ایسی گفتگو کے لیے جو فرخ مرزا نے غالبؔ سے کی، بچے کا سن زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے گویا ساڑھے آٹھ سال کی عمر میں فرخ مرزا نے غالبؔ سے یہ گفتگو کی۔ دسمبر ۱۸۶۸ء تقریباً ۹ سال کی عمر میں اپنے نام کا خط لکھوایا۔ جسے غالبؔ نے کچھ دنوں بعد لکھ کر اردوئے معلیٰ میں شامل کر دیا۔

اس خوبی خو اور فرخی سیرت پر اس کی فرخ سیر کہتا ہوں ۔۔۔۔۔۔'

نواب امیر الدین احمد خاں (فرخ مرزا) نے خود ایک مرتبہ جناب غلام رسول مہر مرحوم کو بتایا کہ "خطوں کے چھپنے کا شہرہ سُنا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خاندان کے سب لوگوں کے نام خط ہیں تو میں نے بھی مرزا صاحب سے عرض کیا کہ دادا جان! ہمارے نام بھی ایک خط لکھ دو۔ اس موقع پر مرزا نے فرمایا کہ 'دادا' تمہارے امین الدین احمد خاں ہیں میں تو تمہارا 'دلدادہ' ہوں۔ یہ فقرہ خط میں بھی لکھ دیا" یہ بات اواخر ۱۸۶۸ء کی ہوگی۔

پھر غالباً انہیں تاریخوں (یعنی دسمبر ۱۸۶۸ء یا جنوری ۱۸۶۹ء) میں علائی کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

"میں تمہارے باپ (نواب امین الدین احمد خاں) کا تابع، تمہارا مطیع: فرخ مرزا کا فرماں بردار[۲]۔۔۔۔۔۔ آج فرخ صاحب کے نام رقعہ پہنچ جائے گا[۳] ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

رقعہ بنام فرخ مرزا یہ ہے:۔

"اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنے سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں بین غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین تمہارا باپ علاء الدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استادِ کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفرین صد آفرین۔ میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ ربُّ العالمین ہے، یہ دعا

---

۱ خطوطِ غالب۔ کتاب منزل لاہور۔ بار دوم۔ ص ۱۱۱ حاشیہ

۲ کیونکہ رقعہ (خط) فرخ مرزا کے کہنے (حکم) سے لکھا ہے

۳ یعنی کاتب کے پاس یا مطبع میں پہنچ جائے گا

مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمہارے
پردادا حضرت فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنّت آرام گاہ کے
برابر جاہ و جلال عنایت کرے ۔ میاں تمہارے دادا امین الدین احمد خاں
بہادر ہیں مَیں تمہارا دلدادہ ہوں ۔ خبردار ۔۔ ہر جمعہ کو اپنی صورت
مجھے دکھا جایا کرو ۔ والدعا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

قصّہ جو نظم ہوا ہے وہ یہ ہے : نواب علائی اپنے بیٹے فرّخ مرزا کو کم سنی ہی
سے اپنے ساتھ ادبی مجالس میں لے جایا کرتے تھے تاکہ بچّے کے علم میں اضافہ ہو۔ ایک
دفعہ غالبؔ کی صدارت میں ایک محفلِ شعرا آراستہ ہوئی، جس میں لفظ "بسمل" پر
تکرار تھی (کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے) اچھے اچھے ادیب جمع تھے ۔ علائیؔ بھی کم سن
فرّخ مرزا کے ساتھ موجود تھے ۔ جب محفل برخواست ہوگئی تو فرّخ مرزا نے غالبؔ سے
"بسمل" کے معنی پوچھے ۔ غالبؔ نے (مذاق میں) کہا کہ اپنے چھوٹے دادا ضیاءالدین احمد
خاں نیّرؔ و رخشاںؔ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو ۔ علائیؔ نے غالبؔ سے عرض کیا۔
کہ یہ کیا مذاق ہے ۔ آپ بچّے کو کوئی بھی معنے بتا دیجئے ۔ خیر ، فرّخ مرزا ضیاءالدین احمد
خاں کے پاس گئے ۔ اُنھوں نے کہا کہ عزیزم "بسمل" کے معنی تو 'زخمی' ہی ہوتے ہیں ۔
تاہم ایک قصّہ سنو ۔ کچھ عرصہ ہوا کہ دلّی میں تین نہایت حسین بہنیں رہتی تھیں ۔۔ دو
بہنوں نے تو سرسری طور پر زندگی گذار دی ، مگر تیسری بہن مشہور ہوگئی اور پانچ لوگ
اس کے اسیر ہوگئے ۔ گویا وہ پانچوں اس کے 'بسمل' ٹھہرے ۔ پھر اُسے اللہ نے ایک
بیٹا دیا ۔ مگر اب وہ بیٹا کس کو اپنا باپ کہہ کر پکارے ؟ پھر خود ہی فرّخ مرزا کے کان
میں کہا کہ ایسے بیٹوں کا کوئی باپ ہوتا ہی نہیں ۔

جب کا یہ واقعہ ہے فرّخ مرزا پانچ چھے سال کی عمر سے زیادہ کے نہ ہوں گے ۔
گویا لگ بھگ ۱۸۶۵ء کا ستہ ہوگا ۔ تمام واقعے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
ضیاءالدین احمد خاں نیّرؔ و رخشاںؔ نے حقیقت میں داغؔ پر طنز کیا ہے ۔ یہ تین بہنیں

محمد یوسف، جس کا آبائی پیشہ سادہ کاری (سُنار) تھا، مگر ڈیرے داری بھی کیا کرتا تھا، کی بیٹیاں تھیں اور غیر معمولی طور پر حسین تھیں۔ پہلی دو[۱] نے تو گھر بسا لیا۔ مگر تیسری وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم، ضیاء الدین احمد خاں کے علاتی بڑے بھائی شمس الدین احمد خاں سے منسلک ہو گئی۔ اسی تعلق سے نواب مرزا خاں داغ پیدا ہوئے۔ داغ کی ولدیت کو ایک عرصے تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ سخن شعرا میں فصاحت نے تو سرے سے داغ کے باپ کا نام ہی نہیں لیا اور "ولد چھوٹی بیگم" لکھ دیا[۲]۔

چھوٹی بیگم نے کئی گھر بسائے انہیں شوہروں کو نواب ضیاء الدین احمد خان نیر و رخشاں نے بسمل کا نام دیا ہے۔ چھوٹی بیگم کا انتقال تقریباً ۶۶ سال کی عمر میں اگست ۱۸۷۹ء میں ہوا۔ پانچ 'بسمل' یہ ہیں:

۱۔ شمس الدین احمد خاں — ۱۸۲۹ء تا ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۵ء
۲۔ ایک انگریز مارسٹن بلاک — قیاساً ۱۸۳۶ء
۳۔ آغا تراب علی — ۱۸۴۰ء
۴۔ خود نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و رخشاں
۵۔ مرزا فخرو — ۱۸۴۴ء تا ۱۸۵۶ء

۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۹ء والدۂ داغ کا کچھ حال معلوم نہیں۔

نواب مرزا خاں داغ از تمکین کاظمی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء

ص ۲۱ "دلی میں ایک سادہ کار محمد یوسف کشمیری فن کار تھے جو بڑی عمدگی سے اپنا کاروبار چلاتے اور شرافت سے زندگی بسر کرتے

---

۱ بڑی بہن راحت النساء بیگم نے باقاعدہ شادی کر لی تھی اور منجھلی بہن عمدہ بیگم نواب یوسف علی خاں والی رام پور سے وابستہ ہو گئی تھی

۲ مگر بعد میں "تذکرۃ المعاصرین" میں اس کی تلافی کر دی تھی

تھے۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں جو بڑی خوبصورت تھیں ۔۔۔۔۔
بڑی لڑکی کا تو حال معلوم نہ ہو سکا مگر قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ جے پور میں کسی اچھے گھرانے میں پہنچ گئی۔ منجھلی لڑکی عمدہ
خانم، نواب یوسف علی خاں (جو بعد کو نواب رام پور ہوئے)
سے متعلق ہو گئی اور چھوٹی لڑکی وزیر بیگم شمس الدین خاں سے
وابستہ ہوئی۔

شمس الدین خاں اور چھوٹی بیگم کے اس سنجوگ کا نتیجہ
۱۲ ذی حجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء چہار شنبہ ۱۲ گھڑی
۲ پل (۲ بجے دن) کو عالم شہود میں جلوہ گر ہوا ۔۔۔۔۔۔۔"

ص ۳۲ " داغ کی بیوی کا نام فاطمہ بیگم (تھا) ۔۔۔ جن کی دو بہنیں اولیا
بیگم اور عزیز بیگم تھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ص ۳۵۳ " داغ کی ایک خالہ راحت النسا بیگم بھی تھیں جو حافظ ولی محمد ولد
عبدالصمد کشمیری سے بیاہی گئی تھیں۔ چنانچہ داغ کی بیوی فاطمہ بیگم
انہی کی بڑی بیٹی تھیں جن کی بہن اولیا بیگم تھیں ۔۔۔۔۔۔"

ص ۳۵۲ " وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم والدۂ داغ نے مارسٹن بلاک نامی ایک
انگریز سے جو جے پور کا ریذیڈنٹ یا وہیں کسی اور عہدے پر تھا،
ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی بادشاہ بیگم نامی کو بھی جنم دیا
تھا۔ داغ نے اپنے جس شیر خوار فرزند احمد کا تذکرہ گلزارِ داغ
میں کیا ہے وہ امیر مرزا ہی کا لڑکا تھا جسے داغ نے گود لیا تھا ۔۔۔"

مندرجہ بالا سے صاف اور سیدھے لفظوں میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ

۱۔ داغ کے نانا کا نام محمد یوسف کشمیری تھا۔

۲۔ داغ کی والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا، جن سے بڑی

دو بہنیں اور تھیں

۳۔ داغ کی بڑی خالہ کا نام راحت النسا بیگم تھا اور چھوٹی کا عمدہ خانم

۴۔ بڑی خالہ راحت النسا بیگم کی تین بیٹیاں تھیں، سب سے بڑی فاطمہ بیگم (زوجۂ داغ) منجھلی بیٹی اولیا بیگم (۔ لاڈلی بیگم جنہیں داغ کی بیوی نے گود لیا تھا انہی کی نواسی تھیں) اور سب سے چھوٹی عزیز بیگم

۵۔ داغ کی اہلیہ فاطمہ بیگم کے بطن سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ احمد جس کا انتقال شیر خوارگی ہی میں ہوگیا، داغ کا لے پالک بیٹا تھا اور امیر مرزا (ولد مارسٹن بلاک) کا فرزند تھا۔ گلزارِ داغ (مطبوعہ ۱۸۷۸ء) کے ص ۶۲ پر ایک غزل کے آخری دو شعر اسی احمد سے متعلق ہیں ؎

احمد کے غم میں دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ دل کا سرور تھا مری آنکھوں کا نور تھا

اے داغ! صدمۂ غمِ ہجراں بجا درست یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

زبانِ داغ میں اولیا بیگم اور عزیز بیگم دونوں کے نام دو دو خط موجود ہیں۔ خط بنام اولیا بیگم مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۰۳ء سے ظاہر ہے کہ داغ کی بڑی خالہ راحت النسا بیگم کا انتقال ہو چکا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تم لوگ اپنی والدہ کی قبر پر بھی جاتی ہو؟ ضرور وہاں جاؤ۔ . . . . ."

اوپر داغ کی والدہ کے ایک اور شوہر مارسٹن بلاک اور اس کی اولاد کا ذکر آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ داغ کے علاتی بھائی بہن کئی تھے۔ تفصیل یہ ہے۔

والد یعنی شمس الدین احمد خاں سے

دو بہنیں (۱) احمد النسا بیگم اور (۲) شمس النسا بیگم (بیوی افضل النسا بیگم)

اور ایک بہن (۳) رحمت النسا بیگم (داشتہ چمپا)

والدہ یعنی وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم سے

ایک بھائی (۴) امیر مرزا اور ایک بہن (۵) بادشاہ بیگم (خاوند مارسٹن بلاک)
ایک بھائی (۶) آغا مرزا شاغلؔ (خاوند آغا تراب علی)
ایک بھائی (۷) مرزا خورشید عالم (خاوند مرزا فخرو)

گویا داؔغ کے علاتی بھائی بہنوں میں تین بھائی تھے۔ آغا مرزا شاغل، امیر مرزا اور مرزا خورشید عالم۔ اور چار بہنیں تھیں، احمد النسا بیگم، شمس النسا بیگم، رحمت النسا بیگم اور بادشاہ بیگم۔ داؔغ نے کم و بیش ان سب سے زندگی بھر نباہا والد شمس الدین احمد خاں کی بیٹیوں سے کم کم اور والدہ چھوٹی بیگم کی اولاد سے بیش از بیش۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ داؔغ کے یہاں کہیں شمس الدین احمد خاں کی بیٹیوں کا نام دیکھنے سننے ہی میں نہیں آیا۔

دِلّی دربار

ملکۂ وکٹوریہ کا عہد تھا کہ ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز نے ہندوستان کا دَورہ کیا۔ ہندوستانیوں نے عموماً اور والیانِ ریاست نے خصوصاً اُن کا استقبال کیا۔ ۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن، جو ابھی چالیس سال کے بھی نہ تھے۔ ہندوستان کے وائسرے مقرّر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء کے آغاز میں ملکۂ وکٹوریہ کا انتقال ہوگیا۔ فروری ۱۹۰۱ء میں طے پایا کہ ملکۂ وکٹوریہ کی یادگار قائم کی جائے۔ نتیجے میں کلکتہ کی خوبصورت وکٹوریہ میموریل بلڈنگ وجود میں آئی۔

وہی پرنس آف ویلز جنہوں نے ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کا دَورہ کیا تھا۔ اب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم بنے اور اُن کی تختِ نشینی کی خوشی میں یکم جنوری ۱۹۰۳ء[۱] کو دہلی میں لارڈ کرزن نے ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی انگریزی شاہی تقریب اس شان و شوکت سے نہیں منائی گئی تھی[۲]۔ تمام والیانِ ریاست

---

[۱] یکم جنوری ۱۹۰۳ء مطابق ہے ۹ رمضان ۱۳۱۸ھ کے

[۲] مشہور مؤرخ ایشوری پرشاد نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں سخت قحط پڑا ہوا تھا اس لیے ہندوستانیوں نے اس شان و شوکت اور فضول خرچی کا عام طور پر بہت بُرا مانا

مدعو تھے۔ نظام حیدر آباد کی شمولیت بھی لازمی تھی۔ اُنھی کے ساتھ داغ بھی آئے۔ اس موقعے کے دو مضمون ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ داغ کے تعلق سے یہ مضامین بہت اہم ہیں۔ یہ اگرچہ عام طور پر معلوم ہیں تاہم بقولِ میرے

کب شنیدہ ہو دیدہ کے مانند[1]

آنکھوں دیکھی کی بات ہی کچھ اور ہے اس لیے مضمون جُوں کے توں درج کیے جاتے ہیں۔ پہلا مضمون جناب بےخود دہلوی مرحوم کے قلم سے بعنوان "داغ کی شخصیت" ہے جو مارچ ۱۹۴۰ء کے ساقی میں شائع ہوا تھا۔ یہ شمارہ میرے پیشِ نظر ہے۔ دوسرا مضمون مولوی عبدالرزاق کانپوری کا ہے جو دہلی دربار کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مضامین "یادِ ایام" مطبوعہ ۱۹۴۶ء میں چھپا ہے۔ اصل ماخذ تک میری رسائی نہیں ہو سکی اس لیے اس کا اقتباس "نواب مرزا خاں داغ" از تمکین کاظمی سے لے کر شامل کیا جاتا ہے۔

ان تحریروں میں دہلی دربار ہی کے تعلق سے نہیں داغ کے عادات واطوار کے تعلق سے بھی اچھا مواد موجود ہے۔

(۱) داغ کی شخصیت

(از بےخود دہلوی۔ "ساقی"، شمارہ مارچ ۱۹۴۰ء)

کون سا دل ہوگا جو استادِ داغ کے غم میں داغدار نہیں۔ میں تو اُن کا شاگرد ہوں اور شاگرد بھی ایسا جو ہر گھڑی دم کے ساتھ تھا۔ نہ میں اُن سے جدا نہ وہ مجھ سے الگ۔ سیر و سفر میں بھی اگر میں اُن کے

---

[1] "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ" کا ترجمہ

ساتھ نہ ہوتا تھا تو سلسلۂ رسل و رسائل، بعد کی ملاقاتیں، زبانی باتیں تلافی ملاقات کر دیتی تھیں۔ ایک بات ہو تو بتاؤں، ایک قصّہ ہو تو بیان کروں۔ ایک غم ہو تو روؤں۔ بس یوں سمجھو کہ مردِ خدا کو میں جانتا تھا اور میری خدائی اس سے وابستہ تھی۔ حضرتِ داغ کی تصویریں تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ اس نقّاش کے نقش و نگار سے تو آپ کی آنکھیں آشنا ہوں گی، لیکن کچھ واقعات کے نقش میرے دل پر رہ گئے ہیں لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھ لیجئے۔

شام کا وقت ہے۔ دربار کا موقع ہے۔ اعلیٰ حضرت حضورِ نظام کا کیمپ دلی کلب میں رونق افروز ہے۔ ایک خیمہ داغ صاحب کو ملا ہوا ہے۔ میں حاضرِ خدمت ہوں۔ رمضان المبارک کا مہینہ۔ افطار کا انتظام۔ استاد خود افطاری تیّار کرا رہے ہیں۔ گو روزے سے نہیں ہیں لیکن ثواب میں ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ میں نے دست بستہ عرض کی کہ "گھر جاکر روزہ کھول لوں گا۔ آپ کیوں تکلیف فرما رہے ہیں"۔ ارشاد ہوا "ارے سیّد تجھ کو تیرے نانا بخشوالیں گے مجھ کو بھی تو کچھ ثواب کما لینے دے"۔

باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ "بے خود۔ یار ہماری طبیعت تو کند ہوئی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "استاد کیا فرما رہے ہیں آپ۔ آپ کی طبیعت اور کند۔ یہ تو خنجرِ برّاں، تیغِ آبدار ہے۔ اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام۔"

بولے "تُو تو جانتا ہے۔ حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں۔ یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ۔ یہاں پریوں کے پر جلتے ہیں اور یہاں میاں بے خود، ایک دفعہ تم نے ہرن کے کباب کھلائے تھے۔ وہ اس مزے کی چاٹ تھی کہ آج تک ہونٹ چاٹتا ہوں۔ حیدرآباد میں ہرن

دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس کے گوشت کو جی ترستا ہے۔ ایک دفعہ تو بیٹا پھر ویسے ہی کباب کھلاوے۔ خدا کرے تیری طبعِ شوخ و شنگ میدانِ سخن میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرے۔"

میں نے کہا۔"بہت بہتر، ایک دو روز میں حاضر کروں گا۔" پھر بڑی دیر تک صحبت آراستہ رہی۔ کس مزے کی باتیں تھیں اور کیا لطفِ صحبت تھا ؎

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

رات گئے میں واپس آیا۔ صبح جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر آدمی نے آواز دی۔ معلوم ہوا اُستاد نے پرچہ بھیجا ہے۔ کھول کر پڑھا تو صرف یہ مصرع درج تھا۔ ؎

نہیں ملتی یہاں ہرنی ترستا ہوں کبابوں کو

میں ہرنی کا مطلب بھی سمجھ گیا اور کبابوں کا مدعا بھی۔ اُستاد کو آہو چشموں سے کچھ اس بلا کا عشق تھا کہ ان کی مفارقت سے وحشت ہوئی تھی اور اُن کی موانست سے طبعِ چابک دست چوکڑیاں بھرنے لگتی تھی۔ میں نے دوسرے روز ہرن کی دو رانیں منگوا دلی کے ایک رکاب دار کے حوالے کیں اور کہہ دیا کہ سیخ کے کباب اور جس جس طرح کے کباب تم کو پکانے اور تلنے آتے ہیں دوپہر سے پہلے پہلے تیار کر دو۔ مزید براں مختلف قسم کے اور کھانوں کا بھی اہتمام کیا۔ مثلاً نور محل پلاؤ، کچی بریانی، رنگترا پلاؤ، دو تین طرح کے پر سندے، متنجن اور نان پاؤ کے ٹکڑے، دو بہنگیوں میں رکھوا کر جا پہونچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہ ضیغمِ میدانِ سخنوری گو عمر میں بڈھا ہو گیا تھا۔ لیکن طبع جواں رکھتا تھا۔ جس وقت میں پہونچا تو اُستاد نے خضاب باندھ رکھا تھا۔ فربہ اندام۔

دراز قامت، چوڑی ہڈّی۔ بھرا ہوا چہرہ۔ بڑی بڑی شوخ آنکھیں۔ ع

آنکھ میں شوخی کس بلا کی تھی

کچھ کہا نہیں جاتا۔ نگاہ قیامت کی فتنہ زا جو سینے کے پار ہو۔ دل میں گھر کرے۔ غرضکہ داغ صاحب عجب سج دھج کے بیٹھے تھے۔ بہنگیاں دیکھ کر بولے "حضرت یہ اتنا کیا لے آئے آپ؟ کیا کسی کی دکان اُٹھا لائے۔"

جاڑے کا موسم تھا۔ تمام چیزیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ میں نے عرض کیا۔ "کھانا نوش فرمانے سے آدھ گھنٹے پہلے فرما دیجئے گا تاکہ کھانا گرم ہو جائے۔" فرمایا۔ "وقت ہو گیا ہے خضاب دھو کر کھانا کھاؤں گا۔" آدمی کو بلا کر کہا۔ "دیکھو محبوب یار جنگ صاحب سے میرا سلام کہو اور کہنا آپ نے کھانا نہ کھایا ہو تو میرے ساتھ کھائیے۔" اس عرصے میں میں نے رکاب دار کو حکم دیا کہ کھانا گرم کرے اور اُس نے دہی اور مکھّن لگا کر سیخیں سینکنی شروع کیں۔ داغ صاحب نہایت سیر خور اور خوش خوراک تھے۔ کھانا کھاتے تھے اور مزے لے لے کر کھاتے تھے۔

بُلبل صحنِ باغ سے اور شاگرد استاد سے دور زیادہ عرصے نہیں رہ سکتا۔ میں دلّی میں تھا اور استاد حیدرآباد میں۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام نے استاد کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا یہ واقعہ بھی قصّہ طلب ہے۔ حضرت داغ نے برسرِ دربار غزل گزرانی۔ مقطع تھا۔

تم نمک خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

وہاں کیا کمی تھی اور کیا دیر۔ حکم ہوا اور ترقی ہو گئی۔ مجھے اطلاع

ہوئی۔ مبارکباد بذریعہ خط پیش کی۔ جواب آیا دور کی مبارک باد ہم قبول نہیں کرتے۔ مَیں نے جانے میں عذر لنگ پیش کیا۔ دوسرا خط آیا۔ اس میں یہ شعر درج تھا۔

دیکھیے تجھ سے مِلاتا ہے خُدا کون سے دن
کون سی رات ہو مقبول دُعا کون سے دن

شعر کے نیچے لکھا تھا۔ یہ شعر تم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ میرے عذر کے جواب میں یہ مصرع تحریر تھا۔ ع :

بے خود بہانے باز ہو تم جانتے ہیں ہم

ہم کو تو بہانہ درکار تھا۔ مجنوں را ہوئے بس است۔ داغ صاحب میرے تو تھے ہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مَیں عاشق تھا اور وہ معشوق۔ وہ شمع تھے مَیں پروانہ۔ اِدھر پروانہ ملا اُدھر مَیں روانہ ہُوا۔

حیدرآباد میں ایک روز شام کے وقت میں اُستاد صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ شعر کہہ رہے تھے مَیں لکھتا جاتا تھا۔ ایک صاحب تشریف لائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُستاد کی زود گوئی کا ذکر آیا۔ ان صاحب نے دریافت کیا۔ اُستاد آپ ایسے جلدی شعر کیونکر کہہ لیتے ہیں؛ اُستاد نے کہا اور جناب کیونکر کہتے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا۔ حقّہ لے کر پلنگ پر لیٹتا ہوں۔ کروٹیں بدلتا ہوں۔ کبھی اُٹھتا ہوں کبھی بیٹھتا ہوں۔ طبیعت پر زور ڈالتا ہوں جب بڑی مشکل سے ایک شعر بنتا ہے۔ داغ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ معاف کیجیے گا۔ آپ شعر کہتے نہیں شعر جنتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ غضب کی بذلہ سنج اور شوخ طبیعت پائی تھی۔ ایک لطیفہ کیا ہزاروں موجود ہیں۔ نمونتہً چند مشتے از خروارے پیش کیے دیتا ہوں۔

ایک دن حضرت نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شاگرد آئے اُن کو نماز میں مشغول دیکھ کر واپس چلے گئے۔ اُسی وقت داغ صاحب نماز سے فارغ ہوئے۔ نوکر نے کہا فلاں صاحب آئے تھے۔ فرمایا 'دوڑ کر بُلا لا'۔ جب وہ آئے تو داغ صاحب نے فرمایا۔ حضرت آپ آکر واپس کیوں چلے گئے؟ کہا۔ 'آپ نماز پڑھ رہے تھے'۔ فرمایا۔ 'حضرت میں نماز پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے'۔

اور سنیئے: ایک مرتبہ رام پور میں نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم کے سامنے لفظ سانس پر بحث چھڑ گئی اس لیے کہ دلّی والے سانس کو مذکر لکھتے ہیں اور لکھنؤ والے مؤنث۔ لکھنؤ اور دلّی کے شعراء موجود تھے۔ ان میں امیر مینائی اور داغ صاحب بھی تھے۔ لیکن استاد بحث کے دوران میں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر جب بحث کو طول ہوا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو نواب صاحب نے فرمایا۔ 'داغ صاحب آپ بھی تو کچھ فرمائیے'۔ استاد نے کہا۔ 'حضور، میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ مؤنث کا سانس مؤنث اور مذکر کا مذکر سمجھا جائے'۔ سب لوگ ہنس کر چپ ہو رہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ قبلہ داغ صاحب نے فرمایا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں میری عمر چوبیس سال کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ نواب شمس الدّین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ آپ کے والد تھے۔ آپ ڈھائی تین برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔

آپ نے فاضل ادیبوں اور عالموں سے عربی فارسی پڑھی تھی۔ ذہین ہونے کی وجہ سے بہت جلد فارغ التحصیل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی زمانۂ قدیم کی تہذیب کے موافق آپ نے فنِ سپہ گری یعنی علی مدہ بانک، بنوٹ، تلوار لگانی، تیر اندازی، شہسواری وغیرہ فنون بھی حاصل کیے۔

بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ معلومات و تجربہ نہایت وسیع تھا۔ طبیعت میں شوخی، چلبلاپن بہت زیادہ تھا۔ ابتدا ہی میں آپ کے اشعار مقبولِ عام ہو گئے تھے۔ حضرت ذوقؔ کے شاگردوں میں جو عروج و شہرت حضرت داغؔ کو نصیب ہوئی وہ کسی اور شاگرد کو میسر نہ ہو سکی۔ آج ہندوستان میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو حضرت داغؔ کے نام سے واقف نہ ہو اور اُسے اُن کے اشعار یا غزلیں یاد نہ ہوں۔

جن لوگوں نے حضرت داغؔ کو دیکھا ہے اور اس زمانے کے مُشاعروں میں شرکت کی ہے، اُس وقت کی محفلوں کو یاد کرتے ہیں، اور روتے ہیں۔ آہ مجھے بھی جب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو گھنٹوں خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ اُن کی وہ شیریں کلامی، وہ بذلہ سنجی، وہ فقروں میں لطافت و ظرافت وہ بات بات میں پھڑکا دینے والے لطیفے، وہ شستہ اور ٹکسال میں ڈھلے ہوئے الفاظ، وہ چُست فقرے، گفتگو کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا گویا علم کا دریا ہے کہ زور و شور سے بہتا چلا جاتا ہے۔ افسوس وہ اردو کا مایۂ ناز شاعر دُنیا میں نہ رہا جس کو یہ دعویٰ تھا اور صحیح دعویٰ تھا ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کلام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو غزل رات کو مشاعرے میں پڑھتے تھے، صبح کو کوچۂ و بازار میں لوگوں کی زبان پر ہوتی تھی۔ اکثر آدمی داغؔ صاحب کی عام مقبولیت پر حسد کرتے تھے۔ حاسدوں میں ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ایک دن داغؔ صاحب کو سرِ راہ ٹوک کر کہا۔ "حضرت آج میرا آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ فرمائیے میں اچھا شعر کہتا ہوں یا آپ؟"

داغ صاحب نے فرمایا۔ "حضرت شعر تو آپ ہی اچھا کہتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کروں کہ لوگ میرے ہی اشعار پسند کرتے ہیں۔"

جسم قدرت نے ایسا بنایا تھا کہ ہر لباس زیب دیتا تھا۔ ٹوپی اس وضع کی پہنتے تھے جیسی لوہارو والے پہنتے ہیں۔ جسم پر کرتا، اس پر نیچی چولی کا انگرکھا، سیدھی تراش کا پاجامہ، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ سلیم شاہی جوتی۔ دلی کے قدیم شرفا کی یہی وضع تھی۔ یہ لباس نیا م رام پور تک رہا۔ حیدرآباد جاکر حیدرآبادی اچکن یا شیروانی، انگریزی جوتا اور منصبی پگڑی استعمال کرتے تھے۔ یہ لباس بھی خوب زیب دیتا تھا۔ حقے کا شوق تھا۔ پیچوان پیتے تھے اور چلم کسی وقت ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ شطرنج، چوسر، گنجفہ خوب کھیلتے تھے۔ گنجفہ میں داغ صاحب کو کبھی میں نے چکمہ کھاتے نہیں دیکھا۔ غضب کی یاد تھی۔ علم موسیقی میں بھی خوب ماہر تھے۔ ستار اچھا بجاتے تھے۔ خوش الحان تھے۔ آواز میں بے انتہا درد تھا۔

مشاعرے میں ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے۔ فصاحت زبان کی بلائیں لیتی تھی۔ الفاظ موتیوں کی طرح ڈھلتے چلے آتے تھے۔ شعر اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ میں نے اُن سے بہتر غزل پڑھتے کسی کو دیکھا نہ سُنا۔ اُن کے سامنے کبھی کسی کی غزل کامیاب نہ ہوتی تھی۔ اخیر عمر میں مشاعرے میں خود غزل پڑھنی چھوڑ دی تھی، کسی اور سے پڑھوا دیتے تھے۔

طبیعت میں نفاست تھی۔ عطر سے بہت شوق تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اوپر کا جسم دھلتا تھا۔ پھر سارے جسم پر عطر ملا جاتا تھا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ ایک کرتا، پاجامہ روز بدلا جاتا تھا۔

نہایت خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ تھے۔ حتّٰی کہ شاگردوں سے بھی آپ اور جناب کہہ کر بات کرتے تھے۔ کسی قدر زود رنج اور نازک مزاج تھے۔ لیکن بہت کم غصہ آتا تھا اور تھوڑی سی معذرت پر فوراً صاف ہو جاتے تھے۔ دوستوں کی تکلیف سے بے چین اور اُن کی خوشی سے خوش ہوتے تھے۔

جوانی میں ایک بچہ احمد مرزا خاں پیدا ہوا تھا۔ لیکن افسوس دو سال کی عمر میں دُنیا سے چل بسا اور پھر اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔

(۲) اقتباس از یادِ ایّام

(مولوی محمد عبد الرّزاق کانپوری)

"دِلّی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی سے متعلق تھا جس میں امرائے دولت کے سینکڑوں خیمے اور بارگاہیں تھیں، صدر پھاٹک پر ملٹری سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک کمرے میں پولس آفیسر جمع تھے۔ مُلاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا جب میں نے مرزا داغ سے مُلاقات کی تحریک کی تو اس نے ورقہ (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا چنانچہ چند کارڈ پیش کیے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھہرے رہے ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور اُن کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ میں جانے کی اجازت ہوئی۔"

"راستے میں صدہا خیمے نظر آئے جو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحبِ خیمہ

کا نام لکھا ہوا تھا ۲۵ منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ اِن بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے، میرے بوٹ کی چرچر کی آواز آرہی تھی، ایک پہرہ دار دوڑتا ہوا آیا اور شریفانہ انداز میں فہمائش کی کہ آہستہ چلئے حضور آرام میں ہیں۔ بوٹ کی آواز کس طرح خوابگاہ تک نہیں جا سکتی تھی تاہم حکم کی بسروچشم تعمیل کی گئی اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد کو مخاطب کرکے یہ شعر پڑھا ؎

اے صبا بر برگ ہائے غنچہ نہ آہستہ پا
پاسبانا نند گل ہا صائبیا خوابیدہ است

میرے دوست نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

میں نے جواباً کہا ؎

سوداؔ کے جو بالین پہ گیا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اَلحَمدُ لِلّٰہ منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پہنچ گئے صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخملی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا۔ چک اٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا کرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ چند منٹ بعد طلبی ہوئی دو درجے طے کرکے تیسرے درجے میں پہنچے تو یہ دیکھا کہ ایک قوی الجثہ شیخ خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اٹھ رہا ہے کیونکہ چلنے سے معذور ہے اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں

بندھی ہوئی ہیں دَرد (عرق النسا) میں مُبتلا تھے۔ بارگاہ کا یہ حصہ نہایت آراستہ تھا ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا تھا وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا اور وسط سے ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ بھڑک رہی تھی۔"

"مرزا صاحب نے کھڑے کھڑے مصافحہ کیا پھر ہمارے اصرار پر بیٹھ گئے کارڈ سے نام تو پہلے معلوم ہو چکے تھے اب نام بنام تعارف ہوا اور بیٹھتے ہی میری جانب پیچوان بڑھایا اور ارشاد فرمایا شغل فرمائیے، میں نے عرض کیا، پیر و مرشد! خُدا نے اِس آگ سے مجھے اب تک محفوظ رکھا ہے، فرمایا اس کا نعم البدل بھی موجود ہے اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے اس لطیفے پر خوب ہنسی ہوئی اور یہ محض شاعرانہ مذاق تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ اخیر عُمر تک زندہ دِل تھے۔"

"میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کے بعض مضامین پر بحث ہوتی رہی۔ اس کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کیے۔ صحیح جواب ملنے پر بہت خوش ہوئے۔ اور حیدرآباد آنے کی دعوت دی اور فرمایا کان پورہ پہنچ کر اپنا فوٹو بھیج دینا، میرے بعد منشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا جناب رعد! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں، رعد نے معذرت کی کہ مسدس حالی کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں تاہم دو تین غزلیں سُنائیں جو قدیم رنگِ شاعری کا نمونہ تھیں۔ اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں ہے لیکن اُردو ادب کی ترقی کے لیے شاعری اور مُشاعروں کا بقا ضروری ہے

البتہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو کانفرنس قائم کرکے اُس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں اُن کی اصلاح کی جائے۔"

"جب یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس۳۰ سال کی محنت میں فرہنگِ آصفیہ (لغت اُردو) لکھی ہے۔ تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے، فرمایا سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مکرّر سوال کرنا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقاتِ لغات میں کوئی اعتراض نہیں البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے، کیونکہ عرب سرائے کی آبادی بیرونی دِلّی ہے"۔

"انگیٹھی سے فاصلے پر چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی۔ رعدؔ نے خیال کیا کہ مصحف ہے چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آ گئی اور رعدؔ بھی سمجھ گئے۔ سرورق کھولا تو مہتابِ داغؔ کا جلوہ نظر آیا"۔

"یہ دکن کی پیداوار تھی۔ رعدؔ نے جو اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے ایک غزل پڑھی، حاضرینِ بزم نے داد دی۔ لیکن جنابِ داغؔ کی موجودگی میں رعدؔ کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی تو یہ شان ہے کہ جناب خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ درخواست منظور ہوئی۔ رعدؔ سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں۔ پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بیست سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے۔ نہ آنکھیں پھڑکتی تھیں نہ ہاتھوں

کو حرکت تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے۔ بیسؔ منٹ میں غزل خوانی ختم ہوئی۔ میری زبان سے برجستہ نکلا آج میں نے داغؔ نہیں ذوقؔ علیہ الرحمتہ کی زبان سے غزلیں سُنی ہیں۔ ذوقؔ کا نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چند منٹ تک خاموشی رہی۔ اس علمی مذاکرے کے بعد چائے کی کشتیاں آئیں جس میں زرد پیالیوں کے سوا کُل سامان نقرئی تھا۔ بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے۔ خود شریک نہیں ہوئے کیونکہ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس درمیان میں چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لیے آئے اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ مرزا صاحب نے مصافحہ اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی۔ افسوس ہے کہ داغؔ کی یہی پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری[1]۔"

داغؔ، نظامؔ کی ہمراہی میں آخر دسمبر ۱۹۰۲ء میں دہلی پہنچے ہوں گے۔ یکم جنوری ۱۹۰۳ء دربار کے انعقاد کی تاریخ تھی۔ بعد ازاں ہفتہ بھر دہلی میں رہ کر حیدرآباد کے لیے واپس روانہ ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ ۱۸/۱۹ جنوری (۱۹۰۳ء) کو حیدرآباد میں داغؔ نے اپنی جائے سکونت پر کلکتے والی منّی بائی حجاب کا استقبال کیا تھا۔

---

[1] یادِ ایام۔ ص ۲۵۰-۲۵۶

داغ اور اودھ پنچ

سنہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ داغ کی شہرت دِلی، لکھنؤ کی رقابت (جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری نے تیز تر کر دی تھی) اور اودھ پنچ[1] کے معنی خیز تیرِ نشتر تینوں نقطۂ عروج کو پہنچے ہوئے تھے کہ افقِ ادب پر احسن، مارہروی شاگردِ داغ کا مرتبہ، سوانحی کارنامہ "جلوۂ داغ" (سنہ ۱۹۰۳ء) نمودار ہوا۔ عقیدت افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے۔ تعصب انصاف نہیں کر سکتا۔ دونوں جادۂ اعتدال سے بھٹک گئے۔

شاگرد استاد کی مدح کر چکا۔ اب اودھ پنچ کے ظریفوں کی باری تھی۔ وہ خم ٹھونک

---

[1] یہ مشہور ہفتہ وار اخبار ۱۶ جنوری سنہ ۱۸۷۷ء کو محلہ دوگاؤں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ ہر پنجشنبہ کو بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ مالک و مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ تقریباً تین ماہ تک کالستھ سماچار میں چھپتا رہا۔ جب اخبار کا ذاتی مطبع محلہ گولہ گنج میں شام اودھ کے نام سے قائم ہوا تو پھر اس میں چھپنے لگا۔ اپنی بامقصد ظرافت کے لیے مشہور تھا (تفصیلات کے لیے دیکھیے مضامینِ چکبست اور تاریخِ صحافتِ اردو)

کر میدان میں اتر آئے اور " جلوۂ داغ پر تبصرے کے پردے میں وہ وار کیے کہ داغ کے حسب و نسب کے ٹکڑے اڑا دیے ۔ داغ بھی زندہ تھے نہ جانے اُن پر کیا بیتی ہوگی مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے خود کو ان کانٹوں میں الجھانے کی کوشش نہ کی ۔

" جلوۂ داغ " پر قسط وار تبصرہ ہو رہا تھا ۔ تحقیق و تنقید کی آڑ میں گھناؤنی قسم کی تنقیص سامنے آ رہی تھی ۔ ۹ جولائی ۱۹۰۲ء کے اودھ پنچ میں مندرجۂ ذیل امور پر بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ :

(ا) " جلوۂ داغ " (داغ کی سوانح عمری) بالکل فرضی تصنیف ہے ۔

(ب) داغ سرے سے ذوق کے شاگرد ہی[1] نہ تھے ۔ اگر ایسا ہوتا تو آزاد ضرور اُن کا تذکرہ کرتے ۔

(ج) ذوق کی شاگردی میں مشاعروں میں شامل ہونا تو کجا داغ ، ذوق کی زندگی میں سن رشد ہی کو نہیں پہنچے[2] ۔

(د) داغ کی والدہ دہلی کے کسی معزز خاندان یا طبقۂ اعلیٰ سے نہ تھیں بلکہ بیرون جات کے کسی معزز خاندان اور شریف گھرانے کی تھیں ۔ لہٰذا قصبات کی زبان کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔

(ہ) داغ رامپور آنے تک علوم و فنون عربیہ فارسیہ اور عروض و قافیہ میں کامل نہ تھے ۔

(و) داغ نے جو کچھ حاصل کیا لکھنؤ والوں کی صحبت کی برکت سے حاصل کیا جو انہیں رامپور میں میسر آئی ۔ پھر انہیں دلائل کو تقویت پہنچانے کے لیے " جلوۂ داغ " پر تبصرے کی دوسری قسط ۱۷ جولائی ۱۹۰۲ء کو شائع ہوتی ہے ۔ جس کا نچوڑ یہ آخری جملے ہیں :

---

[1] داغ یقیناً ذوق کے شاگرد تھے زیادہ سے زیادہ مدت تلمذ ۹ سال (۱۸۴۵ء تا ۱۸۵۴ء) ہو سکتی ہے

[2] پندرہ سولہ سال کی عمر میں شاگرد ہوئے ہوں گے

"۔۔۔۔۔ اب ہم صحیح بیان کیے دیتے ہیں مرزا صاحب (داغ) سولہ برس کے سن میں دلی سے رامپور آئے۔ چالیس برس رامپور میں رہے[1]۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر ایک سال تک اِدھر اُدھر بیکاری کی حالت میں پڑے رہے۔ مولوی غیاث الدین سے فارسی پڑھی۔ اگر گیارہویں برس سے یہ شعر کہنے کا شوق تھا جب ان کی شاعری کی عمر دلی میں پانچ برس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ روشن دلیل ہے کہ وہ طفل مکتب دلی سے آئے تھے اور دلی کا کہا ہوا ایک شعر بھی وہ پیش نہیں کر سکتے۔ بکثرت شاہد موجود ہیں کہ ان کی شاعری کی بنیاد رام پور ہی میں پڑی اور جو کچھ آیا وہ اساتذۂ لکھنؤ کی تعلیم سے آیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

باوجود یہ کہ اس وقت داغ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا مگر آفتاب عمر ڈھل چکا تھا۔ چنانچہ ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اودھ پنچ (ضمیمہ) ۲۲ فروری ۱۹۰۵ء کے صفحہ ۳ کے نیچے بائیں گوشے میں ایک دو سطری مگر سنجیدہ اور جلی خبر شائع ہوئی ہے۔

"افسوس بلبل ہند حضرت داغ دہلوی نے حیدرآباد دکن میں ۹ ذی الحجہ کو انتقال کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

میرے کتب خانے میں اس عہد کے تمام پرچے موجود نہیں۔ اس لیے نہیں معلوم

---

[1] داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چاندنی چوک دلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں بعمر ۹ سال اپنی خالہ عمدہ بیگم کے ساتھ پہلی بار رامپور گئے۔ ۱۸۴۴ء میں بعمر ۱۴ سال دہلی واپس آئے اور قلعہ معلّے میں پہنچے۔ ۱۸۵۷ء کے آخر میں بعمر ۲۶ سال پھر رام پور گئے اور اگلے آٹھ نو سال کبھی دلی کبھی رامپور میں رہے۔ ۱۸۶۶ء میں مستقل طور پر رام پور میں ملازم ہوئے۔ ملازمت کا سلسلہ پورے ۲۱ سال یعنی ۱۸۸۷ء تک قائم رہا۔ ۷ اپریل ۱۸۸۹ء کو بعمر ۵۷ سال حیدرآباد آئے اور وہیں ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو انتقال کیا

کہ ان پرچوں میں کس کس رنگ کی پھلجھڑیاں چھوٹیں اور کیا کیا گُل کھلائے گئے تاہم جو چند پرچے موجود ہیں وہ بھی اس قابل ہیں کہ انہیں قاری تک پہنچایا جائے اور نوّے سال پہلے کی یاد تازہ کی جائے۔

داغ کے انتقال پر ملک بھر میں سوگ منایا گیا مگر اودھ پنچ کے ماتم کا رنگ وہی رہا جو اس اخبار کا ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے داغ کی عظمت کو داغ کی زندگی میں مانا نہ داغ کی موت کے بعد۔ ذیل کے شماروں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۶ مارچ ۱۹۰۵ء جلد بست و نہم نمبر ۱۱

اکبر الہ آبادی اودھ پنچ میں الف ح از الہ آباد کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے ان کی ایک رُباعی[1] دیکھیے۔

افسوس کہ داغ اٹھ گئے دنیا سے	بلبل باغِ سخن کے تھے داغ نہ تھے
تھا ان کے کلام میں وہی رنگ قدیم	گلزار اِرم تھے کمپنی باغ نہ تھے

ایک "تضمین غزل حضرت داغ بلبلِ جناں" چھپی ہے اس کے آخر میں راقم، (منشی سجاد حسین) کا یہ نوٹ ہے:

"یہ تضمین مرزا لاابالی[2] نے ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں کی تھی۔ اس وقت وہ اپنی عمر کی بائیسویں بہار دیکھ رہے تھے جس کو آج ہم نے جب کہ بلبلِ ہند داغ گلشنِ فردوس میں اپنے دلکش چہچہوں سے حورانِ بہشت کے غنچہ ہائے دل کو باغ باغ کر رہے ہیں۔ طائرانِ نیم بِسمل ہو رہے ہیں ناظرینِ اودھ پنچ کے پیش نظر کر دیا۔

---

[1] یہ اشعار رباعی کے مخصوص اوزان میں ہیں مگر تھی طور پر رباعی کے لوازم کو پورا نہیں کرتے کیونکہ مصرع اوّل میں قافیہ اور ردیف نہیں

[2] اصلی نام اور تخلص تا حال معلوم نہیں

یہ تضمین داغ کی اس غزل کی ہے جس کا مطلع ہے ؎

میں اور حرفِ شکوہ، غلط اے صنم غلط
واللہ جھوٹ ہے یہ، خدا کی قسم غلط

کل چودہ[۱۴] بند ہیں۔ مقطع اس طرح ہے ؎

یاں تک تو چپ تھے، خیر تھی، پھر میں نے خواہ مخواہ
طنزاً کہا کہ "ہم ہی تھے جو کر دیا نباہ"
بس کہنے ہی کی دیر تھی جل کر، ملا نگاہ
بولے وہ داغ! آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ
معشوق سے شکایتِ جور و ستم غلط

یہ غزل داغ کے پہلے دیوان گلزارِ داغ (۱۲۹۶ھ) کے ص ۱۱۲-۱۱۳ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ آخری شعر[۱] مقطع سے مربوط ہے۔ اس لیے اسے بھی درج کیا جاتا ہے۔

بس بس نہ اتنی عشق کی حضرت بگھاریئے — آنکھیں نکالیے نہ یہ سینہ ابھاریئے
چلیے یہاں سے بوریا بدھنا سنبھالیے[۱] — حوروں سے ملیئے خلد بریں کو سدھاریئے
دنیا میں آپ کا نہیں ہونے کا غم غلط

ایک مضمون کا عنوان ہے "روتا ہوں بھئی روتا ہوں"۔ اگرچہ نام نہیں لکھا تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منشی سجاد حسین ہی کے قلم سے ہے۔ مضمون داغ کی وفات کے نوحے اور قطعۂ تاریخ کی تمہید کے طور پر لکھا ہوا ہے۔ مگر اس میں اس زمانے کے لکھنؤ کی عیش پرستی پر بھی بے باکانہ چوٹ ہے بعض آخری چند سطروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

"..... ایسے شہر میں ...... تعیش اور خلوت کا یہ حال ہے کہ دس دن محرّم میں بھی

---

[۱] نہ جانے اودھ پنچ نے یہ قافیہ کیوں کر روا رکھا

بھی شاہد پرستی سے باز نہیں رہتی .... غمِ حسین کے پردے میں مرثیوں کی
اوٹ میں کھلم کھلا گانا سنتی، سوز و ساز کے لطف، لوگوں سے چھیڑ چھاڑ کے
مزے لوٹتی ہے۔ بس بندہ بھی قیودِ شاعری کو سلام کرکے نوحہ یا حضرت داغ کی
وفات کا قطعۂ تاریخ لکھتا اور خوب جی کھول کر روتا ہے۔ اگر روتے نہ بنے
تو بقول ؎

لو گرفتار ہوں آتی نہیں فریاد مجھے

معاف فرمائیے گا -----------------"

اب نوحہ سنئیے۔ نوحے کے کل گیارہ شعر ہیں۔ آخری مصرع کے ٹکڑے سے تاریخ
نکالی ہے ؎

کہتا ہے دل کہ ہائے وائے ہائے امیر وائے داغ

۱۳۲۲ھ

چند اشعار ملاحظہ کیجیے کہ تمام تر منشی صاحب کے موقف کو ظاہر کرتے ہیں ؎

دے گئے داغ امیر و داغ۔ ہائے امیر وائے داغ
دل کو ہو غم سے کیا فراغ۔ ہائے امیر وائے داغ

کرتی ہیں رنڈیاں جو بین، چوک[1] میں اک ہے شور شین
غل ہے بجائے یا حسین، ہائے امیر وائے داغ

کام ہے اپنے کام سے ورنہ غرض سلام سے
کہہ دے کوئی نظام[2] سے، ہائے امیر وائے داغ

---

[1] مراد چوک: لکھنؤ کی رنڈیوں سے ہے

[2] میر محبوب علی خان نظام حیدرآباد دکن شاگرد داغ

وہ جو ہمیں ستائیں گے ہم بھی دکن ہی پائیں گے
مر کے تو نام پائیں گے، ہائے امیرؔ وائے داغؔ
بس کہ مرض تھا لا دوا ہونا تھا جو وہی ہوا
دابا اجل نے ٹینٹوا، ہائے امیرؔ وائے داغؔ

ایک اور قطعۂ تاریخ بھی دیکھیے۔ یہ "راقم ہائے وائے" کے قلم سے ہے۔ یعنی منشی سجاد حسین کی اختراع ہے۔ کل پانچ شعر ہیں۔ صرف دو شعر درج کیے جاتے ہیں ؎

مجھ سے گھبرا کے کہی ہاتف نے جلدی سے یہ بات
سال تاریخی مسیحی سے جو دوری رہ گئی
پَر کتر کے لے گئے داغؔ اور از روئے تلق
شاعری ہندوستاں میں اب لنڈوری رہ گئی

۱۹۰۵ء

اس قطعہ میں ایک مصرع تھا "میرے ذمہ ان کی کچھ باقی مزدوری رہ گئی"۔ چونکہ قافیہ میں "مزدوری" نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے دیہات کی زبان استعمال کی اور "مزدوری" کو قافیہ بنالیا۔ اس لفظ کی خامی کو ایک نوٹ کے ذریعے بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے۔
"اگر یاد رہے تو منی آرڈر کے ساتھ مزدوری کی (د) بھی پارسل کردیجیے گا۔"

اودھ پنچ کے بیشتر ظریف اپنا اصلی نام اور تخلص ظاہر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ دوسرے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ جیسے اے۔ ایچ۔ الہ آباد، راقم، مورخ وغیرہ، انہیں میں ایک "الانسان ضاحک" تھے جن کی ایک نظم بعنوان "ذکر خیر" ۶ اپریل ۱۹۰۵ء جلد بست و نہم نمبر ۱۴ کے پرچے میں پڑھیے

یادش بخیر! لے کے اجل نے مٹا دیا
گویا کہ داغ صفحۂ ہستی پہ داغ تھے

---

[1] امیرؔ مینائی اور داغؔ دونوں ہی نے حیدرآباد دکن میں وفات پائی

تھے باعث نشاط کبھی موجب صداع
بلبل تھے ناچ گھر میں کلب گھر میں زاغ تھے
گھبراتے تھے ولایتی حکم کی سیر سے
مخمورِ حسن کیفیت جام باغ تھے
مجلس میں ان کی پورٹ نہ وسکی نہ شامپین
سیندھی کے موتیا کے فقط کچھ ایاغ تھے
شائستہ لیڈیوں کا نہ مطلق تھا واں نشاں
ہاں تھے تو لولیوں کے پتے تھے سراغ تھے
باتوں میں چوچلے تھے طبیعت میں شوخیاں
روشن خیال تھے نہ وہ عالی دماغ تھے
کس نے کہا کہ تھے وہ نئی روشنی کے لمپ
وہ تو الہ دین کے طلسمی چراغ تھے

پھر ایک مراسلہ شائع ہوتا ہے جس کے لکھنے والے کا نام ونشان یہ ہے ۔" راقم مورخ تعلیم ایک اے ۔ بی بدالونی" عنوان ہے "داغ کی تاریخیں" یہ داغ کا مرنا تھا کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی ۔ ہندوستان کے طول وعرض میں رسالوں اور اخباروں میں تاریخیں بکثرت نکل رہی تھیں ۔ جن میں اچھی بری سب شامل تھیں ۔ مراسلے کی عبارت سے داغ سے عداوتِ مستقل تو ظاہر ہے ہی غضب "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر صاحب کو بھی زیر بارِ احسان کیا گیا ہے ۔ مراسلہ دلچسپ ہے اس لیے قطع وبرید کے بغیر دیا جاتا ہے ۔

"جناب داغ دہلوی کا انتقال ایسا نہ تھا جس کا صدمہ کسی شاعر کو نہ ہوا ہو اور شاید ہی کوئی فرد شاعر ایسا ہو جس نے تاریخ کی فکر نہ کی ہو ۔ ایجانب نے اکثر تاریخوں کا ملاحظہ آپ کے اخبار و نیز دیگر اخبارات میں کیا مگر کوئی تاریخ پسند نہ آئی ۔ بہت سے شعرائے نے نواب مرزا داغ کے حرفوں میں تاریخ ارتحال نکالی

۱۳۲۲

ہے۔ جس سے مرنا کسی طور پر ثابت نہیں ہوتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مولود کا نام تاریخی شاعر تجویز کرتے ہیں۔ حضرت عشرت لکھنوی نے البتہ انہیں الفاظ میں ایک بات پیدا کی ہے جو بہرحال قابلِ ستائش ہے۔ اب تک اودھ اخبار وغیرہ میں جو قطعات چھپے ہیں ان پر خیر اس وجہ سے کہ ایڈیٹر صاحب کو شاعری سے کچھ علاقہ نہیں ہے ہم کچھ ریویو نہیں کرتے۔ البتہ تعجب اس بات کا ہے کہ ریاض الاخبار کے لائق ایڈیٹر نے اس کے صفحات ایسے مہمل اور بے معنی تاریخوں سے سیاہ کرنے پر کیوں کمر باندھی ہے۔ ریاض الاخبار میں جناب حفیظ جونپوری (ہمارے پرانے شاعر جو اب نئی شاعری کو رغبت کی نظر سے دیکھتے ہیں) کی تاریخیں اور ان کے شاگرد و دیگر شعراء کی جدت طبع دیکھ کر مجھ سے چپکا نہ رہا گیا۔ جناب حفیظ نے آہ ناگاہ کا قافیہ واویلاہ ترمیم فرمایا ہے جس کی نظیر اساتذۂ قدیم و حال کے کلام میں نہیں ملتی۔

عیسوی تاریخی مصرعہ فرماتے ہیں ؎

شاعری داغ کے گئے ہمراہ

۱۹۰۵ء

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب کوئی شاعر باقی نہیں رہا۔ حالانکہ ابھی جلال و تسلیم کے علاوہ امیر کے شاگردوں میں ہمارے مکرم حضرت ریاض و جلیل و اختر وغیرہ وغیرہ ایسے شعر گو موجود ہیں جو آپ اپنی نظیر ہیں اور مصرع سے داغ کا انتقال طرفِ عالم جاودانی کے ثابت نہیں ہوتا۔

اسی اخبار میں حفیظ کے شاگرد رشید داغ کے مرنے کی خبر اس مصرع سے دیتے ہیں ؎ "شاعری ہو گئی یتیم افسوس"

میں بہت خوش ہوں گا اگر استاد یا شاگرد صاحب شاعری کی والدہ کا نام بتائیں گے۔ اس لیے کہ میں انجمن حمایت بیوگان کا ممبر رنڈوا اور ماشاءاللہ

شاعر بھی ہوں۔ تاریخ ایسی ہونی چاہیئے۔ پیدائش کی ہو یا انتقال کی کہ جس کے مادہ کے مصرع سے ہم سمجھ سکیں کہ فلاں پیدا ہوا یا فلاں مرا۔ ایسی جیسی اسے ریاض الاخبار میں ایک شخص مرگِ داغ کی تاریخ "افصح داغ زمانہا" سے نکالتے ہیں۔

بلبلِ ہندوستان کے بجائے بلبل ہندان کے شاگردوں نے انہیں لکھا ہے جس پر بلبلِ ہند بہت ناخوش ہیں اور عجب نہیں جو کوئی استغاثہ پیش کر دیں کہ میں زندہ ہوں مجھے کیوں مردہ لکھا جا رہا ہے۔ ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء جلد بست و نہم نمبر ۱۵

کسی نامہ نگار نے ایک "لوکل خبر" بھیجی۔ لوکل کے معنی کتنے بھی محدود کیوں نہ ہوں اور خبر کا تعلق لاکھ لکھنؤ سے ہو مگر موسم کے لحاظ سے اس میں مرگِ داغ کا ذکر ضروری تھا اور ذکر بھی ایسا جو قطعی اودھ پنچ کے مزاج کے موافق ہو۔ اس خبر کا انداز بہترین ظریفانہ خوبیوں کا حامل ہے۔ جس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ اختصار کے ساتھ یہ خبر درج کی جاتی ہے۔

"قادر المنحوس ابو الحوادث حضرت طاعون الدولہ کے ہاتھوں شہر کا قافیہ برسوں سے تنگ ہے۔ کیا سبب ادھر کوئی مشعر و شاعری کا مدعی ہوا۔ ادھر انہوں نے دستِ شفقت پھیرا۔ نہ فاصلۂ کبریٰ کا خیال نہ صغریٰ سے مطلب۔ فوراً طرحی غزل سے پہلے بیچارے شاعر کے اعزاز کو سلام کر کے نوحے کی طرح دے دی۔۔۔ ابھی تھوڑے دنوں کا ذکر ہے۔ ہمارے فصیح الملک حضرت داغ ہی کو اربع عناصر کی رباعی سے لفظِ حشو   کی طرح خارج کر کے حیات کے مصرعِ برجستہ کو تقطیع سے گرا دیا۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء جلد بست و نہم نمبر ۱۶

مرگِ داغ کا تذکرہ جاری ہے۔ جہاں تک ممکن ہے داغ کی تضحیک و تنقیص مدِ نظر ہے۔ داغ کے ساتھ نظام دکن کو بھی کوسا جا رہا ہے۔ ایک قطعۂ تاریخ تمہید کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ عنوان ہے "آپ اپنا ماتم" کچھ اختصار کے ساتھ تمہید اور قطعہ دونوں ملاحظہ کیجیے۔[1]

"کہتے ہیں داغ کا ماتم بے فکروں یا شاعروں میں خوب ہو رہا ہے اور بقول شخصے خدائے سخن شاعروا، کا، بادشاہ[2] تک اس غم میں شریک ہے۔ بیچارہ داغ کو رونے روتے آخر عقل کو رو چکا .... بس بہ نظر مناسب اینجانب اپنا ماتم آپ کرتے ہیں۔ دشمنوں کے کان بہرے اگر بالفضل وکمال مر گئے تو ان لوگوں کو فرصت کہاں جو ماتم کریں گے۔ لگے ہاتھوں حضرت داغ کا بھی ایک قطع تاریخ اپنے قطع وفات کے ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اینجانب کا مصرعۂ تاریخ ذرا ڈھونڈا ہے مگر .... کچھ پروا نہیں .... اس معاملہ

---

[1] کہیں کہیں سنجیدہ تاریخیں بھی دکھائی دے جاتی ہیں مگر بہت کم۔ اب تک کے پرچوں میں صرف تین تاریخیں ایسی ملی ہیں جو طنز سے مبرا ہیں۔ مثلاً ۱۳ اپریل ۱۹۰۵ء کے پرچے میں اُمید امیٹھوی کا ایک قطعہ فارسی میں ہے۔ آخری دو شعر یہ ہیں ؎

شد آں داغ سخنور رہگرائے عالم باقی	چہ خیزد از سخن راندن خموشی اصلا گویم
گرائے امید غمگیں سالِ تاریخش کسے پرسد	برفت از عالم فانی فصیح الملک و ماگویم
	۱۳۲۲ھ

ایک ایک شعر رعب شاہ آبادی کے قطعات سے جو ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء کو شائع ہوئے۔

گفت تاریخ وفاتش رعب زار	آہ داغ دہلوی مرد آہ آہ
	۱۳۲۲ھ
رعب سے تاریخ جو پوچھی تو رہ رہ کر کہا	ہوگیا زیر زمیں پنہاں سپہر شاعری
	۱۳۲۲ھ

[2] محبوب علی خاں نظام دکن شاگرد داغ

میں حضرت داغ اگر مجھ سے رشک کریں تو بجا ہے۔ کیوں کہ حضرت کا کام طبقۂ نسواں میں باوجود اس قدر مرغوب ہونے کے کسی نیک بخت نے اس طرف توجہ نہ کی، دُور کیوں جائیے۔ خود حضرت کی معشوقۂ خاص بھی ایک مصرعہ تک نظم نہ کر سکیں۔ خیر اپنی اپنی کرنی اپنی اپنی بھرنی۔"

وہوھذا

یوں ہے نیرنگِ دہر کا ایسا	استحالہ خوشی سے ہو غم کا
تاکہ بازیچہ گاہ عالم میں	اک تماشا ہو داغ کا مرنا
ایسے طوفانِ بے تمیزی میں	میں بھی بن جاؤں شاعرِ غرّا
ہو کہیں ایسی خوبیٔ تقدیر	مجھ کو عہدہ ملے ریاست کا
بعدہٗ اس قدر فراغت ہو	اک بتِ مہ جبیں کا ہوں شیدا
سُن کے مرنا وہ مطلع تاریخ	یوں کہے نظم کر کے برجستا

تاقیامت نہ مجھ کو بھولے گا
"داغ دے جانا آج بھڑوے کا"

۱۳۲۲ھ

یہ تاریخیں منشی سجاد حسین ہی کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔ ان میں داغ کی معشوقہ کلکتہ والی حجاب کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اشارہ کر چکے ہیں کہ حجاب نے داغ کی وفات پر ایک مصرع تک نہ کہا۔ اس قطعے کے آخر میں کہا ہے کہ حجاب کی سرد مہری دیکھ کر آخر داغ اس دنیا سے اُٹھ گئے ـــــ اُس بُتِ بے حجاب' اور اس سے داغ کا "بھڑوا" کرنا منشی صاحب کے ذوقِ سلیم کی انتہا ہے ؎

ہر طرف شورِ شین ہے یہ کیا	مر گئے داغ ہو چکا جھگڑا

سال تاریخ اُن کے مرنے کا　　میں نے ہاتف سے جس گھڑی پوچھا
کچھ سمجھ بوجھ کے غرض اک بار　　میری جانب وہ دیکھ کر بولا
اک بُتِ بے حجاب سے آخر
"واہ وا داغ نے کیا پردا"

۱۳۲۲ھ

اب ایک قطعہ تاریخ اور سنیے۔ منشی صاحب نے اس وقعہ رہی سہی کسر پوری کردی۔ یعنی قطعۂ تاریخ حجاب ہی کی زبانی کہہ دیا۔ پہلے ایک شعر میں تمہید بیان کی ہے پھر قطعہ شروع ہوتا ہے ؎

تعبیرِ خوشنما ہے خوش آیند خواب کی
تاریخِ موتِ داغ زبانی حجاب کی

رکھتے تھے وہ جو "بلبلِ ہندوستاں" خطاب
صورت میں تھے جو رشک وہ زاغ مر گئے
لالہ کو جو جلاتے تھے، گلزارِ[۱] داغ سے
وہ داغ بخشِ گل کدہ و باغ مر گئے
فریادِ[۲] داغ جن کی سنی زشت وزاغ سے
وہ مستغیثِ دشت و برو راغ مر گئے
شوخیِ طبع جن کی تھی مصروفِ لہو ولاغ
وہ محوِ لہو و شیفتہ و لاغ مر گئے

۱؎ داغ کا دیوان اوّل
۲؎ مثنوی داغ جس میں حجاب سے معاشقے کا حال ہے

بھیجا تھا جن کو عشق علیہ السلام نے
پیغام عشق کر کے رد، ابلاغ مر گئے
تاریخ اس کی پوچھی جو میں نے حجاب سے
بولیں وہ مسکرا کے "اے لو داغ مر گئے"

۱۳۲۲ھ

مگر معلوم ہوتا ہے کہ داغ کے خلاف اودھ کے اس جہاد کا باہر والوں نے تو کیا خود اہل لکھنؤ نے بھی کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ وہ بدستور داغ کی عظمت کو تسلیم کیے رہے۔ اس بارے میں چکبست لکھنوی داغ کی وفات کے چند ماہ بعد (منشی سجاد حسین کی حیات ہی میں) "زمانہ" (جولائی ۱۹۰۵ء) میں پوری انصاف پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں کہ میدان سخن میں اس وقت اگر کوئی داغ کا مد مقابل ہو سکتا تھا تو وہ امیر مینائی تھے لیکن امیر کی طبیعت کو شاعری سے وہ ازلی مناسبت نہیں ہے۔ جو داغ کا حصہ ہے اور کہ "داغ کے قدرتی طور پر شاعر ہونے میں کلام نہیں" آگے چل کر کہتے ہیں کہ اگرچہ حریفوں نے اعتراضات کی فکر میں دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر داغ کا کلام عموماً شاعری کے ظاہری عیبوں سے پاک ہے اور ان کا ضروریات شعری سے باخبر ہونا ثابت کرتا ہے۔ چکبست داغ کی زبان کے جادو اور شاعری سے ان کے طبعی تعلق کو کلیتاً تسلیم کرتے ہیں۔

داغ کے خلاف اودھ پنچ کا یہ پروپیگنڈہ کس قدر بے معنی ثابت ہوا یہ بھی چکبست (مضامین چکبست ص ۱۳۲) کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

"..... اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ تک اڑا کیں، جس کا رخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے حسب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا ...."

کچھ تلامذۂ داغؔ[۱] کے تعلق سے

(نوحؔ ناروی[۲]، جوشؔ ملسیانی[۳]، سیمابؔ اکبرآبادی[۴] اور آغا شاعرؔ دہلوی[۵])

(۱) ۲ اپریل ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں کینیا (مشرقی افریقہ) کی راجدھانی نیروبی میں تھا کہ مجھے ایک پارسل ملا۔ کھولا۔ ۲ جلدیں "اعجازِ نوحؔ" کی نکلیں۔ "اعجاز نوحؔ" (عالی جناب ناخدائے سخن، تاج الشعرا، فصیح العصر منشی و مولوی محمد نوحؔ صاحب) نوحؔ ناروی شاگرد و جانشین فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی مرحوم کا دیوانِ سوم ہے۔ اور یہ جلدیں خود انہیں نے بھجوائی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ استاذی قبلہ جوشؔ ملسیانی کے کہنے پر انہوں نے بھجوائی ہوں گی۔ چنانچہ میں نے ۹ اپریل ۱۹۵۲ء کو

---

[۱] ولادت ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء وفات ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء

[۲] ولادت ۱۸ ستمبر ۱۸۷۸ء وفات ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء

[۳] ولادت یکم فروری ۱۸۸۳ء وفات ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

[۴] ولادت ۵ جون ۱۸۸۲ء وفات ۳۱ جون ۱۹۵۱ء

[۵] ولادت ۵ مارچ ۱۸۷۱ء وفات ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء

اُنھیں لکھا۔

"آپ کی بھیجی ہوئی دو جلدیں "اعجازِ نوحؔ" کی مجھے مل گئی ہیں۔۔۔۔

۔۔۔ معلوم ہوتا ہے قبلہ جوشؔ ملسیانی نے آپ کو لکھا ہے۔ چند جلدیں اور بھی میرے دوستوں کے لیے مطلوب ہیں جن کے لیے قبلہ موصوف کو مَیں نے لکھ دیا ہے۔ قیمت اُنہیں کی طرف سے آپ کو مل جائے گی۔۔۔۔۔۔"

اس خط کے ساتھ مَیں نے اپنی دو غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیج دیں تاکہ بعد اصلاح تبرّک کے طور پر اُنھیں اپنے پاس رکھ سکوں۔ لیکن ایک عرصے تک اُن کی طرف سے جواب نہ آیا۔ مَیں نے دوبارہ لکھا تو اُن کا خط مع غزلیاتِ اصلاح شدہ ملا۔ غزلوں کے مطلعے یہ تھے اور اتفاق سے ان پر کوئی اصلاح نہیں ہوئی تھی۔

یہ نیا تُو نے ستم اے ستم ایجاد کیا
یاد آ آ کے مجھے مائلِ فریاد کیا

مزا جب ہے کریں باہم خطاب آہستہ آہستہ
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

اصلاح کی خوبی اور خامی سے قطع نظر کر کے دونوں غزلوں سے صرف ایک ایک شعر مع اصلاح پیش کرتا ہوں، کیونکہ ان دونوں میں دو فنّی نکتے ہیں جن سے مبتدی شعرا استفادہ کر سکتے ہیں :

شعر آج پھر کس نے مرے چَین کو برباد کیا ؛ کس طرح بھید کھُلے کس نے مجھے یاد کیا

اصلاح شکر کرتا ہوں کہ ناشاد کو دل شاد کیا ؛ بھول کر بھولنے والے نے مجھے یاد کیا

توجیہہ دونوں مصرعوں میں (کس نے) اچھا نہیں تھا

شعر لگا ساغر لبوں سے پی نہ کرآب آہستہ آہستہ یہ نہیں کم ہو گا دل کا اضطراب آہستہ آہستہ
مطلع ثانی

اصلاح اُٹھائے اپنے رُخ سے وہ نقاب آہستہ آہستہ یہ نہیں کم ہو گا میرا اضطراب آہستہ آہستہ

توجیہہ قوافی میں الف سے پہلے (ر) ہے۔ اگرچہ یہ صورت غلط نہیں لیکن بارِ سماعت ضرور ہے۔

یہ دونوں غزلیں میرے پہلے مجموعۂ کلام 'شعلۂ خاموش' (مطبوعہ ۱۹۶۸ء) کے ص ۱۷۷ اور ص ۲۴۹ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

داغ کے شاگردوں میں جو بعد میں اپنے اپنے وقت میں لگ بھگ سب استادِ سخن کہلائے، میں نے اصلاح کا یہی طریقہ دیکھا ہے کہ وہ پہلے تو شعر میں اگر عیب ہو تو، اُسے دور کرتے تھے اور حاشیے پر وجہ اصلاح لکھ دیتے تھے، پھر جن شعروں کی ترکیب یا بندش سُست معلوم ہوتی تھی اُنہیں چُست کر دیتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے بعض اوقات پورا مصرعہ بھی بدل دینا پڑتا تھا۔ نوح صاحب نے میری غزلوں کو اسی نظر سے دیکھا تھا۔

جنابِ نوح کا میرے نام خط یہ ہے:

"قدر افزائے نوح سلامت۔ سلام و دعا

پہلا خط آپ کا میری عدم موجودگی میں آیا اور بچے رکھ کر بھول گئے۔ جب دوسرا خط ملا تو پہلا خط تلاش کیا گیا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ مل گیا۔ لہٰذا بعد ترمیم و تنسیخ کے واپس کرتا ہوں۔

یہی وجہ تاخیرِ جواب کی ہے۔

بھائی جوشؔ صاحب نے مزید جلدوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ جس وقت وہ حکم دیں گے، روانہ کردی جائیں گی۔ مطمئن رہیے۔ اصلاح میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

نوحؔ از الٰہ آباد

محلہ لیک گنج مصری باغ

(۲) جیسا کہ حضرتِ نوحؔ ناروی کے خط سے ظاہر ہے استاذی قبلہ جوشؔ ملسیانی اور حضرتِ نوحؔ ناروی میں بڑی یگانگت تھی۔ جب ۱۹۴۰ء میں جوشؔ صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام 'بادۂ سر جوشؔ' چھپا تو نہ صرف جنابِ نوحؔ نے اس مجموعۂ کلام کا طویل پیش لفظ تحریر فرمایا تھا بلکہ ایک نظم بھی لکھی تھی جو اسی مجموعۂ کلام کے ص ۱۱ پر "ارشاداتِ گرامی" کے تحت درج ہے۔ فرماتے ہیں۔

کیا وصفِ جنابِ جوشؔ لکھیے غارت گرِ صبر و ہوش لکھیے

اندازِ کلام اثر میں ڈوبا نشتر کی طرح جگر میں ڈوبا

ہر مطلع آفتاب اُن کا ہر مقطع لاجواب ان کا

جو بات ہے انتخاب ہے وہ جو شعر ہے کامیاب ہے وہ

جو حرف وہ حرف دلنشیں ہے جو لفظ وہ لفظ نازنیں ہے

ترتیبِ غزل ہو سست کیونکر تخئیل ہو نادرست کیونکر

خوش فکر ہیں خوش دماغ یہ ہیں شاگردِ رشیدِ داغؔ یہ ہیں

اسلاف کی یادگار ٹھہرے تاجِ سرِ افتخار ٹھہرے

جوشؔ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جناب نسیمؔ[۱] بھرت پوری مرحوم کی سفارش

---

[۱] ولادت ۱۸۶۱ء وفات ۱۹۰۹ء

پر داغؔ کے شاگرد ہوئے تھے۔

جناب نسیم بھرت پوری، داغؔ کے پہلے دور کے شاگردوں میں تھے اور جناب نوحؔ دوسرے دور کے شاگردوں میں۔ گو جوشؔ صاحب کو داغؔ کی آخری عمر کا زمانہ ملا۔ تاہم وہ شہرت میں اپنے مشہور خواجہ تاش بھائیوں میں کسی سے کم نہیں رہے۔

(۳) جنابِ نوحؔ ناروی سے جوشؔ صاحب کی پہلی ملاقات ۲۹ دسمبر ۱۹۳۶ء کو پنڈت امرناتھ مدن ساحرؔ دہلوی کی بزمِ سخن کے سلور جوبلی کے مشاعرے میں ہوئی تھی۔ چنانچہ جوشؔ صاحب ماہ جولائی ۱۹۳۷ء کے رہنمائے تعلیم لاہور میں رقم طراز ہیں

"محترمی نوحؔ ناروی نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا اور نہایت گرم جوشی سے معانقہ فرمایا۔ میں حیران تھا کہ کون صاحب ہیں جو اس قدر محبت و خلوص سے حالاتِ صحت پوچھ رہے ہیں۔ میں مصنوعی تعارف سے استفسارات کا جواب دے رہا تھا اور ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ آخر میرا قیاس یقین پر غالب آیا اور میں جان گیا کہ بحرِ معانی کے شناور یکتا، ناخدائے سخن فصیح العصر نوحؔ ناروی یہی ہیں۔۔۔۔۔۔"

(۴) "اعجازِ نوحؔ" کے ص ۲۹۲ پر درج ہے

"شروعِ جنوری (حقیقت میں ۲۸ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۳۶ء) کو دہلی میں جناب پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی نے اپنا پچیسواں مشاعرہ سلور جوبلی کے نام سے کیا (حالِ مشاعرہ کے بعد جنابِ نوحؔ کی طرحی غزل ہے)"

اس یادگار مشاعرے سے متعلق ایک کتاب "خورشیدِ خاوری" چھپ چکی ہے۔ کتاب کے نثری صفحات ۸۴ ہیں اور شعری حصہ ۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک گروپ فوٹو بھی ہے جن میں ۷۵ معروف اور کم معروف شاعر شامل ہیں۔

دو طرحیں دی گئی تھیں۔

اُردو ۔ اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

فارسی ۔ تنگ چشمم گر نظر بر چشمۂ کوثر کنم

اس مشاعرے میں داغ کے کئی شاگردوں نے حصّہ لیا تھا جن میں جنابِ نوح ناروی اور قبلہ جوشؔ ملسیانی بھی شامل تھے۔ جناب نوح نے صرف اُردو طرح پر ہی فکر کی تھی، جوشؔ ملسیانی صاحب نے دونوں زبانوں میں کہا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

نوحؔ ناروی

سب کہتے ہیں آفت ہے غمِ عشق بلا ہے — یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں کیا جانیے کیا ہے

لاتا نہیں ایمان کوئی عشق دوتا پر — یعنی وہی تشکک ہے، وہی کیوں ہے، وہی کیا ہے

نکلیں دلِ پر داغ سے آہیں دمِ گریہ — بھیگی ہوئی گل زارِ محبّت کی فضا ہے

طوفانِ محبّت میں کوئی بس نہیں چلتا — کشتی کی طرح نوحؔ کا دل ڈوب رہا ہے

جوشؔ ملسیانی

ہر گام پہ آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے — دنیا مری نظروں میں گناہوں کی سزا ہے

اے مستِ رعونت یہ جوانی نہ رہے گی — جس حُسن پہ نازاں ہے وہ پر تول رہا ہے

کچھ جذبۂ صادق ہو کچھ اخلاص و ارادت — اس سے ہمیں کیا بحث وہ بُت ہے کہ خدا ہے

خوش فکر تو اے جوشؔ ہزاروں نظر آئے — لیکن سخنِ داغؔ کا عالم ہی نیا ہے

جوشؔ صاحب کے دو شعر فارسی طرح میں بھی سُن لیجیے ؎

اے خوشا وقتے کہ یادِ آں رُخِ انور کنم — کیفِ خود را بے نیاز شیشہ و ساغر کنم

پائے رفتن ہم نمی دارم بہ بازی گاہِ عشق — من کہ ہر فردِ بساطِ دہر را ششدر کنم

(۵) اس مشاعرے میں جناب سیماب اکبر آبادی بھی شامل تھے۔ چند شعر اُن کی طرحی غزل سے ملاحظہ کیجیے ؎

لفظوں کے پرستار خبر ہی تجھے کیا ہے   جب دل سے لگی ہو تو خموشی بھی دعا ہے
کچھ نقص نہیں حسن دلآویز میں لیکن   یہ نقص ہی کیا کم ہے کہ محرومِ وفا ہے
بہ جاتی ہوئی رات کا گاتا ہوا عالم   خاموش ہر اک چیز ہے دل بول رہا ہے
خاکسترِ محفل کو نہ ٹھکرائیے سیماب   یہ راکھ نہیں، مقبرۂ اہلِ وفا ہے

جوشؔ صاحب نے لکھا ہے کہ اس مشاعرے میں "بعض دفعہ نہایت اچھے شعر کی داد کے لیے سخن فہم حضرات ذوق وسخن سے متاثر ا سٹیج تک آتے اور وہاں پہنچ کر داد دینے کی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ اور تو اور جناب فداؔ گانوٹھی شاگردِ جنابِ داغؔ مرحوم نے بھی باوجود اس پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہٹ کے دو دفعہ اسٹیج تک آنے کی زحمت گوارا فرمائی اور جی کھول کر داد دی۔ ایک دفعہ تو جنابِ سیمابؔ کے ایک شعر پر اور ایک دفعہ خاکسار راقم الحروف، (جوشؔ ملسیانی) کے شعر پر"۔

قبلہ جوشؔ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شعر یہ تھے ؎

جوشؔ ملسیانی   اے مستِ رعونت یہ جوانی نہ رہے گی   جس حسن پہ نازاں ہے وہ پرتول رہا ہے

سیمابؔ اکبر آبادی   کچھ نقص نہیں حسنِ دلآویز میں لیکن   یہ نقص ہی کیا کم ہے کہ محرومِ وفا ہے

اس مشاعرے میں محبّی ندا فاضلی کے والدِ محترم جناب دعاؔ ڈبائیوی (شاگرد نوحؔ ناروی) بھی شامل تھے۔ جوشؔ صاحب فرماتے تھے کہ ان کے مقطعے کی بے ساختگی پر انہیں بھی بہت داد ملی تھی ؎

یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی   تاثیر نہیں خاک مگر نام دعا ہے

(۶)   شاعر کسی درگاہ کا مصلحت آمیز متولی یا ملک کا سلطان تو نہیں ہوتا۔ پھر

اس کی جانشینی کیسی۔ یہ وبا جناب جلیل مانک پوری شاگرد امیر مینائی کی مصلحت آمیز جانشینی سے شروع ہوئی تھی اور پھر ایسی پھیلی کہ داغ کے انتقال کے بعد اُن کے شاگردوں میں بھی بہت سے استاد کی جانشینی کے مدعی بن بیٹھے اور یہ تنازعہ اگست ۱۹۱۹ء تک چلا۔ اِن مدعیانِ جانشینی میں آغا شاعر دہلوی بھی تھے۔ سلور جوبلی مشاعرے میں ان کی طرحی غزل بھی دستیاب ہے۔ دو شعر (ایک مطلع اور مقطع) درج کیے جاتے ہیں ؎

کیوں بے سبب آزردہ ہے کیوں مجھ سے خفا ہے
دل جیسی رقم پوُج تو دی، اب یہاں کیا ہے

شاعر کو جو پوچھا تو یہ فرماتے ہیں ہنس کر
دیکھا تو نہیں ہم نے مگر نام سُنا ہے

آغا شاعر دہلوی افسر الشعرا کے لقب سے جانے جاتے تھے اور بڑے ٹھسے کے اُستاد تھے۔ ایک عرصہ جہاں استاد داغ کی خدمت میں رہ چکے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ماہنامہ "آفتاب" جھالاواڑ کے مرتب و مدیر تھے۔ میرے پیشِ لفظ اس رسالے کا (جلد ۷، نمبر ۱۱) نومبر ۱۹۲۱ء کا شمارہ ہے۔ اس رسالے میں وہ "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" کے عنوان سے قسطوں میں ایک مضمون لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے میں قسط (۳) چھپی ہے بلاحظہ کیجیے :

بزمِ داغ کے چشمِ دید نقوش

(۳)

بوٹی کی اصلاحیں

ایک دفعہ سرکاری مشاعرے کی زمین تھی۔ "آسماں سے"، "کہاں سے"۔ میں نے

بھی اُس میں غزل لکھی۔ اربابِ کمال کا مجمع۔ جوانی کا زور، مقابلے کی ترنگ۔ غزل خوب کھلی۔ اسی دوران میں یکایک ایک مصرعہ اُولیٰ قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑا۔ جس کے لیے ویسا ہی بے تکلف مصرعۂ ثانی مطلوب تھا۔ ہر چند فکر کی۔ لاکھ لاکھ زور مارے مگر دل جیسا چاہتا تھا ویسا مصرعہ نہ ہوا پر نہ ہوا۔

آہ! یادش بخیر۔ وہ مصرعہ یہ تھا ؎

تبسّم زیرِ لب رُخ پر لٹیں ہیں

جب میں بالکل ہی مایوس ہو گیا تو چار و ناچار وہی مصرعہ لے کر استاد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُس زمانے میں آپ افضل گنج رہتے تھے اور جب کبھی کسی کو دِلّی یادِ دلّی والوں کی سیر کرنی مقصود ہوتی وہ افضل گنج استاد مرحوم کی بارگاہ میں چلا جاتا بس بلا مبالغہ دلّی کا لطف آ جاتا تھا۔

آج جو میں گیا تو ویسی ہی گہما گہمی تھی۔ میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ ہر شعر کو توجہ سے سماعت فرمایا۔ جب مقطع کی نوبت آئی تو میں خاموش ہو گیا۔ خود ہی فرمایا "اور صاحب" اور اس وقت میں جی کڑا کر کے عرض کر ہی دیا۔

اور تو ایک مصرعہ ہے فقط۔

فرمایا یہ تو آپ کی عادت میں داخل ہے۔ اچھا ارشاد۔ ارشاد!

میں نے ڈرتے ڈرتے۔ سہمے سہمائے عرض کیا یہ مصرعۂ اُولیٰ ہے۔ بس ایسا ہی بے تکلف مصرعۂ ثانی بھی چاہتا ہوں۔ اگر عطا ہو جائے۔ ع

تبسّم زیرِ لب رُخ پر لٹیں ہیں

سامعین گوش بر آواز ہو گئے۔ چند ہی لمحے فکر میں گزرے ہوں گے جو لاثانی اُستاد نے کسی قدر مُسکرا کر فرمایا "لو بھئی آغا! آج آپ کی خاطر سے ایک نیا محاورہ نظم ہو گیا"۔ اور معاً دونوں مصرعے اس طرح پڑھ دیے جیسے مدّتوں سے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے ؎

تبسم زیرِ لب — رُخ پر لٹیں ہیں

عطیہ : یہ لٹ دھاری بنے آئے کہاں سے ؟

آہاہا! سبحان اللہ! یہ لٹ دھاری بنے آئے کہاں سے ؟ یہ سننا تھا کہ مَیں تڑپ گیا اور بے اختیار سر دھننے لگا۔

اب کسی اہلِ زبان سے پوچھئے۔ یہ کیا مصرعہ عنایت ہوا ہے۔ اہلِ بصیرت انصاف کریں کہ پہلے مصرعہ کس قدر الگ الگ تھا اور اب دوسرے مصرعے نے پیدا ہوتے ہی شعر کو اپنے مقام سے بلند کر کے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ دیکھئے۔ دیکھئے! غور کیجئے!

ے تبسم زیرِ لب۔ رُخ پر لٹیں ہیں
یہ لٹ دھاری بنے آئے کہاں سے؟

دُوسری لاثانی اِصلاح

اسی طرح پھر ایک دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا۔ جس کی طرح تھی 'چمک میرے لئے، مہک میرے لئے'۔ اب کی دفعہ ایک مصرعہ ثانی ایسا لاجواب ہو گیا جو اُولی کا محتاج تھا یعنی

برچھیاں کھاتی ہیں جھپکانی پلک میرے لئے

مَیں پھر حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کیا بندہ نواز۔ ع

برچھیاں کھاتی ہیں جھپکانی پلک میرے لئے

للہ اس پر ایسا ہی مصرعہ اُولیٰ لگا دیجئے۔ مرحوم ہنس پڑے۔ آج پلنگڑی پر استراحت تھی اور تلامذہ کا ایک جمِ غفیر گرد جمع تھا۔

مصرعہ سُنا۔ پھر سنا اور بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ اس استراحت کی وجہ یہ تھی کہ مرحوم

نقرس کے مرض میں سخت تکلیف اُٹھاتے تھے اور وہ ناشدنی دورہ اکثر پڑتا تھا۔ چنانچہ آج بھی کئی کئی دن سے صاحبِ فراش تھے۔ چوکی بھی قریب لگی ہوئی تھی مگر اس کرب اور اضمحلال میں طبیعت اُسی طرح جوان تھی۔ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ مَیں نے دوڑ کر گاؤ تکیہ لگا دیا اور پائیں اُن کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ استاد بھی فکر کرنے لگے اور یارانِ طریقت بھی حسبِ معمول طبع آزمائی فرمانے لگے۔ اتنے میں استاد مرحوم نے دو مصرعے فرمائے۔ پڑھے اور خاموش ہو گئے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب عالم کو اپنی حاضر طبعی پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے بھی دو ہی مصرعے بار بار عرض کئے مگر مَیں نے دھیان بھی نہ دیا۔ اس پر اُنہیں سخت ملال ہوا اور اُنہوں نے اُستادِ مکرم کو اشتعال دینے کے لئے معاً مجھ سے یہ خطاب کیا۔ آغا صاحب! یہ کیا بات ہے، ہم سب برابر کاوش کر رہے ہیں۔ اچھے اچھے مصرعے پیش کرتے ہیں۔ خود حضرت صاحب (اُستاد بہادر) تے پے در پے دو مصرعے فرمائے۔ مگر آپ ہیں کہ بالکل "صُمٌ بُکمٌ"۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟۔

اُن کا تو یہ کہنا اور میرے تلوؤں سے جو لگی تو سر میں جا بجھی۔ بس بے اختیار میری زبان سے یہ لفظ نکل گئے۔ صاحب عالم! آپ مجھے معاف کریں۔ مَیں جانوں اور حضرت قبلہ۔ جب مصرعہ ہو گا میں خود شکریہ ادا کروں گا۔ بندہ پرور! آپ نے جیسے مصرعے فرمائے ہیں۔ ایسے تو چھوکریاں کہہ دیتی ہیں۔ چھوکریاں۔ میرا یہ کہنا اور استاد کا مُسکرانا۔ صاحب عالم کے تو مان مر گئے۔ مگر خدا غریق رحمت کرے استاد مرحوم کو۔ الٰہی اُن کی کروٹ کروٹ جنت ہو۔ انہوں نے بات ٹالنے کو اُسی وقت مسکرا کر کہا۔

ہاں صاحب وہ مصرعہ کیا ہے۔ مصرعہ۔ مَیں نے پھر عرض کیا۔ ؎

برچھیاں کھاتی ہیں جھپکاتی پلک میرے لئے

بس خدا بخشے انہوں نے پھر فکر کی اور آخر چند ہی منٹ میں وہ لاثانی مصرعہ لگا دیا جو مرتے مرتے مجھے یاد رہے گا۔ مصرعہ ملاحظہ ہو ے

آنکھ لگتی ہے خیالِ نوکِ مژگاں میں کہاں؟ برچھیاں کھاتی ہیں جھپکاتی پلک میرے لئے

باللہ العظیم، یہ مصرعہ سننا تھا کہ مَیں اپنی جگہ سے دیوانہ وار کھڑا ہو گیا، اور دوڑ کر استاد کے قدم چوم لیے ____ حضرات! یہ ہے شانِ استادی اور اسے کہتے ہیں اصلاح جو اب دنیا میں مفقود ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥

خواجہ تاش بھائیوں کی جدّت

اس کے بعد کھلّم کھلا بعض بھائیوں کو مجھ سے پرخاش ہو گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی۔ آخر چند روز بعد ایک بڑی سازش ظہور پذیر ہوئی۔

اُس کی منصوبہ بندی چلی کہ چند صاحبوں نے استاد مرحوم سے یہ جڑی کہ صاحب! آغا شاعر کے غزل پڑھنے کے بعد پھر کسی کا رنگ ہی نہیں جمتا۔ ہر مشاعرے میں ہماری سخت توہین ہوتی ہے۔ بھولے بھالے فرشتہ صفت استاد نے فرمایا "بھئی پھر وہ ترکیب بتاؤ جس سے اُس کا رنگ پھیکا ہو جائے اور تم لوگ سرسبز ہو" جواب میں عرض کیا گیا۔ مشاعرے سے دو روز پہلے حضور اُس کی غزل سُن لیں' اور جو جو قافیے اس کے ہاں چمکتے ہوئے نظم ہوں وہی قافیے مخصوص طور پر آپ ہمارے ہاں نظم کر دیں۔ پھر ہم وہی غزل اُس سے پہلے مشاعرے میں پڑھیں گے۔ مگر ہاں اُسے قدغن فرما دیں کہ جب تک تمہارے پیر بھائی اپنی غزلیں نہ پڑھ لیں تم ہرگز نہیں پڑھ سکتے۔

اُستاد نے فرمایا۔ منظور۔ بلاؤ آغا شاعر کو۔ مجھ کو کانوں کان اس جت ویز کی خبر نہ تھی۔ جب میں بُلایا گیا اور مجھ سے اُستاد مرحوم نے ان شرائط پر ہامی بھروائی تو مَیں نے بغیر سوچے سمجھے سب باتوں کا اقرار کر لیا۔ دو دن پہلے اُستاد نے دوبارہ شعر پڑھوا کر وہ قافیے بھی) جانچ لیئے اور مجھے چُپ چپاتے رخصت بھی کر دیا۔

وَاللّٰہُ عَالَمُ بِالصَّوَابْ ٥ مجھ سے یہ ساری کہانی چچا صاحب مرحوم نے نقل کی تھی۔ مگر آگے چل کر جو گذرا اُس سے واقع کی کڑیاں بالکل مل گئیں۔ چنانچہ میری غزل کا مطلع تھا :-

گلابی آنکھ اُس میکش کی مجھ سے آشنا کم تھی
شرابِ لعل گوں تھی تو سہی لیکن ذرا کم تھی

اُسی دوران میں ایک شعر تھا جس میں 'ہوا' کا قافیہ نہایت چُست بندھ گیا تھا۔ اُستاد بہادر نے بس وہی قافیہ یاروں کے مشورے سے بھانپ لیا اور میرے جانے کے بعد ناداں اور بھائی بارق مرحوم کے ہاں بجنسہٖ وہی قافیہ خود نظم فرمایا۔

اب جو مشاعرہ شروع ہوا۔ میرے احباب تک غزلیں پڑھ چکے۔ مجھ سے فرمائش بھی ہوئی۔ مگر میں بدنصیب بھائیوں ہی کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ آخر صدرِ جلسہ صاحب جو حاکمِ وقت تھے۔ ان سے نہ رہا گیا اور اُنھوں نے سرِ مشاعرہ مجھ سے غزل نہ پڑھنے کی وجہ دریافت کی۔ چار و ناچار عرض کرنا پڑا کہ جناب عالی! میرے استاد کا حکم نہیں کہ میں اپنے پیر بھائیوں سے پہلے اپنی غزل پڑھوں۔ فرمایا۔ یہ حکم تمہیں کب ملا؟ میں نے عرض کیا۔ یہ اسی مشاعرے سے تین روز پہلے۔

پھر فرمایا کہاں ہیں وہ تمہارے پیر بھائی ؟

میں نے عرض کیا۔ آج اُنہیں کسی سبب سے دیر ہو گئی ہے بس اب آتے ہی ہوں گے۔ صدرِ جلسہ صاحب اس دیر کے لفظ پر خدا جانے کیوں افروختہ ہو گئے کہ اُنھوں نے ایک عجیب ناخوشی کے لہجے میں فرمایا۔ نہیں صاحب ہم آپ کو ایما کرتے ہیں کہ آپ ابھی اپنی غزل پڑھیں۔ پیر بھائی آپ کے جب آئیں گے جب وہ اپنی غزل پڑھ لیں گے۔ اگر وہ صبح تک بھی نہ آئے تو کیا مشاعرہ اُن کا انتظار کرتا رہے گا۔؟ اب تو مجھے مجبوراً غزل پڑھنی پڑی۔ کچھ تو لوگ پہلے ہی سے مشتاق تھے کچھ میرے اصرار پر بے چینی بڑھ گئی۔ غرض غزل

معمول سے زیادہ چلی اور خصوصاً ہَوا کے قافیے پر تو لوگ تڑپ تڑپ گئے۔ میں مقطع پڑھ ہی چکا تھا اور شمع دوسری طرف ڈھلی تھی جو برادرانِ مکرم آن پہنچے۔ اُفتاں و خیزاں لڑکھلاتی ہوئی اُن کی ٹکڑی کی ٹکڑی بزم مشاعرہ میں داخل ہوا۔ آداب تسلیم کے بعد ابھی ان کا سانس بھی قائم نہ ہونے پایا تھا جو بھائی نادآن نے سوال کیا۔

کدھر ہیں ہمارے بھائی آغا صاحب! انھوں نے آج ہم سے پہلے تو غزل نہیں پڑھی ہوگی۔ میں ندامت سے ابھی جواب کے لئے تیار بھی نہیں تھا کہ خود صدرِ جلسہ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ ہاں صاحب! وہ تو نہیں پڑھتے تھے مگر ہم نے نہایت اصرار کے بعد اُن سے غزل سُن لی۔ واقعی عجیب عجیب شعر نکالے ہیں۔ بس یہ سننا تھا کہ اِن کے آئے اوسان جاتے رہے، نہایت کبیدہ خاطر ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گئے اور چند منٹ تک برابر آپس میں سرگوشیاں بھی ہوتی رہیں۔

جب شمع اُدھر ڈھلی تو سب صاحبوں نے چمک دمک سے غزلیں پڑھیں۔ مگر جب بھائی نادآن نے ہوا کے قافیے پر سامعین کو متوجہ کیا تو لوگ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں اب بھی خاک نہ سمجھا اور بھائی نادآن کا شعر خالی ہو گیا۔ افسوس ہے وہ شعر مجھے اس وقت یاد نہیں۔ البتہ اُن کے بعد بھائی بآرق مرحوم نے جب یہ شعر پڑھا اور لہک لہک کر سامعین سے دادِ طلب ہوئے تو صدرِ جلسہ صاحب نے بآوازِ بلند کہہ دیا۔ خوب صاحب خوب۔ مگر یہ آغا صاحب کے شعر کا چربہ ہے۔ کوشش تو بہت کی گئی مگر وہ بات کہاں؟

بآرق (مرحوم) صاحب کا یہ شعر تھا جو خاص الخاص اُستاد مرحوم کا عطیہ تھا۔

بآرق مرحوم۔ تمہارے دل جلوں کے سامنے کیا شمع جل سکتی
ہَوا یوں بندھ گئی اُس کی کہ محفل میں ہَوا کم تھی

میرا نقشِ اوّل۔ نکلنے دیں نہ آہیں ضبط نے کنجِ اسیری میں
قفس کو لے کے اُڑ جاتا، مگر ظالم ہَوا کم تھی

مندرجہ بالا اشعار کے گہرے غور و فکر سے اُستاد شاگرد کے مدارج صاف ظاہر ہیں۔ مگر ان کاوشوں سے طبیعت کو جو مزہ ملتا تھا وہ اب کہاں نصیب۔ اُس کے بعد مَیں نے خود حاضر ہوکر استادِ مرحوم سے شکایت بھی کی کہ آپ یوں ہمارے کلیجے میں چھڑیاں مارتے ہیں۔ وہ بہشتی، ساری رام کہانی سنتے ہی نادم ہو گئے اور کہا "بھئی مَیں کیا جانوں۔ جانے میری بلا۔ اُن لوگوں نے مجھ سے شکایت کی اور مجھ پر دباؤ ڈالا کہ آپ وہ قافیہ لکھ دیں۔ مَیں نے لکھ دیا۔ اب مجھے کیا خبر۔ کس کا رنگ کیونکر جمتا ہے اور کس کا پھیکا پڑ جاتا ہے"۔

۷۔ صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشقؔ ٹونکی داغؔ کے شاگرد مشہور ہیں۔ "خمخانۂ جاوید" (جلد پنجم ص ۵۲٦) میں لکھا ہے۔

"عاشقؔ صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب خلف صاحبزادہ محمد سعید خاں ساکن ٹونک۔ آپ نواب امیر خاں کی اولاد سے ہیں۔ اجمیر میں پیدا ہوئے۔ وہیں میو کالج میں ابتدائی تعلیم پائی۔ کچھ عرصے دلی میں بھی رہے۔ نکاتِ شاعری . . . . . . حالیؔ سے حاصل کیے . . . . . . داغؔ کو بھی کلام دکھایا اور انہیں کا رنگ تقریباً دل سے پسند کیا۔ سب سے آخر ظہیرؔ دہلوی سے تلمذ اختیار کیا . . . . ۱۹۰۷ء میں مؤلفِ تذکرہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ فالج کی وجہ سے آپ کا ایک ہاتھ بے کار ہو گیا تھا مگر مشقِ سخن برابر جاری تھی۔ کلام میں روانی اور سلاست ہے، زبان صاف ہے . . . ."

مجھے نہیں معلوم اُن کا دیوان چھپا ہے کہ نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کب تک زندہ رہے۔ لیکن میرے کتب خانے میں ان کے قلمی دیوان بخطِ مصنف کی ردیف (یے) کی غزلیں موجود ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا قلمی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ (اور شاید چھپ بھی گیا ہو)۔ ایک غزل سے پہلے نوٹ ہے:

"۲۵ جون ۱۹۳۸ء کی دوپہر کو سخت گرمی میں یہ غزل کہی — عاشقؔ"

چند شعر سنئے۔ کلام معمولی ہے۔ مطلع بھی دولخت ہے ؎

بہت تھی آپ کی مجھ پر طبیعت، وہ بھی کیا دن تھے
نہ تھی اوروں کی آنکھوں میں مروت، وہ بھی کیا دن تھے
جو کوئی بات میری آپ کے دل کو بری لگتی
تو پہروں ہوتی رہتی تھی شکایت، وہ بھی کیا دن تھے
دجو تا ہوتا شام کا وعدہ تو گھڑیاں گنتے دن کٹتا
محبت کا زمانہ بھی تھا آفت، وہ بھی کیا دن تھے

کچھ اشعار عاشق نے حسرت موہانی کی مشہور زمین میں کہے ہیں مگر وہ مزہ کہاں۔ دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہائے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے ؛ مجھ پر آفت دل کی راحت کا زمانہ یاد ہے
ان کا وہ میری وفا پر خوب ہونا اعتبار ؛ اور کہہ کر بے وفا پھر آزمانا یاد ہے

چند شعر اور ؎

اگر دل میں ہوگی محبت تمہاری ؛ تو سو بار ہوگی شکایت تمہاری
وہ اظہارِ الفت پہ طعنے سے کہنا ؛ ارے اللہ اللہ محبت تمہاری
وہ کہتے ہیں مجھ سے کہ عاشق تمہیں ہو ؛ ارے واہ دیکھو تو صورت تمہاری

ایک بے تکا سا قطعہ بھی ہے ؎

داغ سے ایک شخص نے پوچھا ؛ شعر گو کوئی آپ سا بھی ہے
تو لکھا ہے جو اس کی قدر کریں ؛ میں نے دیوان میں یہ لکھا بھی ہے
اور پھر لکھ کے بھیجا یہ مقطع ؛ یگانے مقطع وہیں رکھا بھی ہے

اُسے عاشق بھی لوگ کہتے ہیں
داغ کا نام دوسرا بھی ہے

گویا خود (عاشق) کو اور داغ کو ایک ہی مرتبے کا شاعر بتایا ہے۔ اللہ رے خوش فہمی۔

مثنوی فریادِ داغ کی تکمیل و طباعت

تمکینؔ	=	داغؔ مصنّفہ تمکینؔ کاظمی
زیدیؔ	=	مطالعۂ داغؔ مصنّفہ ڈاکٹر سیّد محمّد علی زیدی

"جلوۂ داغؔ" جو خود داغؔ کی لکھوائی ہوئی ہے، میں درج ہے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ فریادِ داغؔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۱۱۴)

یہاں داغؔ کی زود گوئی سے بحث نہیں۔ مثنوی کے کُل شعر ۸۳۸ ہیں۔ داغؔ دن بھر میں چار پانچ سو اشعار کہہ لینے پر قادر تھے۔ چھوٹی بحر، روانی اور ہر شعر میں ربط ہونے کی وجہ سے ایسا قطعی ممکن ہے۔ معلوم جو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دو دن کون سے سال کے تھے جب یہ مثنوی کہی گئی۔

داغؔ اوائلِ اپریل ۱۸۸۲ء میں رام پور سے عازم کلکتہ ہوئے تھے اور دہلی، لکھنؤ وغیرہ ہوتے ہوئے اپریل کے آخر میں پٹنہ پہنچے تھے وہاں ایک لمبی مدت گزار کر قیاساً جون کے تیسرے ہفتے میں بذریعہ ٹرین کلکتہ وارد ہوئے۔ ان کے آتے ہی شہر میں دھوم ہو گئی ہے

شہر میں دھوم تھی کہ داغؔ آیا

اوائلِ جولائی میں داغ واپس عازمِ رام پور ہوئے۔ واپسی کا ذکر مثنوی میں یوں کیا ہے ؎

ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا ؎ رمضان ایک دن کے بعد آیا

اس اشارے کی بنیاد پر کیلنڈر دیکھنے کے بعد تمکین اس نتیجے پر پہنچے کہ "داغ ۳ جولائی کو کلکتہ سے چلے، دو دن ریل میں رہے، ۶ جولائی کو تین مہینے بعد بخیر و خوبی رام پور واپس ہوئے۔"

تمکین (ص ۹۳) لکھتے ہیں۔

"فریادِ داغ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں کہی گئی ہے۔ یعنی جولائی اگست ۱۸۸۲ء میں۔ مگر اس کا نام داغ نے دو تین مہینے بعد ماہِ محرم ۱۳۰۰ھ میں رکھا ہے جو تاریخی نام ہے اور اسی سال اس کی طباعت بھی ہوئی ہے۔ مطبع مطلع العلوم و اخبارِ نیرِّ اعظم مراد آباد نے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن چھاپے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زیدی (ص ۲۲۲)، تمکین کے بیان کو دہرانے کے بعد رقم طراز ہیں۔

"فریادِ داغ پہلی مرتبہ محمد امجد علی مالک اخبارِ نیرِّ اعظم مراد آباد نے اپنے مطبع مطلع العلوم سے ۱۳۰۰ھ میں شائع کی۔ اس پر مندرجہ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے ؎

گفت تسلیم سالِ طبعِ او ؎ آفتِ دین فتنہ آرائی

۱۳۰۰ھ

صاحبِ مطبع نے پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں اور وہ بہت جلد فروخت ہو گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر لکھتے ہیں (ص ۲۲۳)

" دوسری مرتبہ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی ۔ محمد فیروز شاہ خاں فیروزؔ نے مندرجہ ذیل قطعے سے سالِ طباعت برآمد کیا ہے ؎

وہ ہیں مضمونِ عالی مثنوی میں ٭ کہ حاصل جس سے معنی کو بلندی
چھپی یہ مثنوی فیروزؔ جس دم ٭ لکھی تاریخِ نظمِ دردمندی

۱۳۰۲ھ

تیسری مرتبہ یہ مثنوی امجد علی نے مراد آباد سے ۱۳۱۳ھ میں پھر شائع کی ۔ فیروزؔ کے حسبِ ذیل کے قطعے سے سالِ طباعت نکلتا ہے ؎

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع ٭ مثنوی وہ جو روح پرور ہے
میں نے تاریخ یہ کہی فیروزؔ ٭ مثنوی یہ ہے یا گلِ تر ہے

۱۳۱۳ھ

اس کے بعد یہ مثنوی متعدد بار شائع ہوئی ہے ۔ مثنوی کے آخر میں محمد ممتاز علی خاں ممتازؔ شاگردِ داغؔ کی تقریظ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مندرجہ بالا سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں ۔

۱۔ مثنوی فریادِ داغؔ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ یعنی جولائی یا اگست ۱۸۸۲ء میں کہی گئی تھی ، مگر اس کا نام ماہ محرم ۱۳۰۰ھ میں رکھا جو تاریخی ہے ۔ اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ میں یہ پہلی مرتبہ (زیدیؔ) مطبع مطلع العلوم و اخبار نیّرِ اعظم مراد آباد میں چھپی ۔ (تمکینؔ) ۔ اس پر مندرجۂ ذیل شعر سالِ طباعت کا درج ہے ؎

گفت تسلیم سالِ طبعِ او ٭ آفتِ دین فتنہ آرائی (زیدیؔ)

۱۳۰۰ھ

۲۔ اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن چھاپے (تمکین)

۳۔ صاحبِ مطبع نے پندرہ سَو جلدیں چھاپی تھیں اور وہ بہت جلد فروخت ہو گئیں (زیدی)

۴۔ دوسری مرتبہ یہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔ محمد فیروز شاہ خاں فیروز نے تاریخ کہی ہے

چھپی یہ مثنوی فیروز جس دم ؛ لکھی تاریخ نظمِ دردمندی

۱۳۰۲ھ (زیدی)

۵۔ تیسری مرتبہ ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی۔ فیروز نے تاریخ کہی ہے

تیسری بار پھر ہوئی مطبوع ؛ مثنوی وہ جو روح پرور ہے

مَیں نے تاریخ یہ کہی فیروز ؛ مثنوی یہ ہے یا گلِ تر ہے

۱۳۱۳ھ (زیدی)

۶۔ اس کے بعد یہ مثنوی متعدد بار شائع ہوئی ہے۔ مثنوی کے آخر میں محمد ممتاز علی خاں ممتاز کی تقریظ ہے۔ (زیدی)

میرے کتب خانے میں مثنوی فریادِ داغ کا ایک قدیم نسخہ ہے۔ اس کے خاتمۃ الطبع میں تحریر ہے۔

"اگرچہ متقدمین دہلی تو غالب، ذوق، مومن تا کا اب اس عالمِ فانی میں وجود باقی نہ رہا مگر اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں۔ اُن میں

سے جناب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی[1] کی ذات مغتنمات
سے سمجھی جاتی ہے ۔۔ ـــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــ

۔۔۔۔۔ مرزا صاحب نے یہ قیامت کی مثنوی تحریر فرمائی
ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار
نیر اعظم مراد آباد ۔۔۔ میں چھپ کر نذرِ شائقین ہوئی ہے ....."

اس پانچویں ایڈیشن سے اوپر اخذ کیے چھیوں نتائج کی بخوبی تغلیط ہو جاتی ہے ۔ ملاحظہ کیجیے
۱۔ مثنوی رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں فکر نہیں کی گئی تھی ۔ رمضان میں تو یوں بھی ایسی مثنوی کے فکر کرنے کا کوئی تک نہیں ہے ۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ ۱۳۰۰ھ (۱۳ نومبر ۱۸۸۲ء تا یکم نومبر ۱۸۸۳ء) ہی میں کہی گئی ۔ اس کے لیے تین شہادتیں پیش نظر ہیں ۔

اوّل فریادِ داغ کا تاریخی نام جو ۱۳۰۰ھ کے برابر ہے
دوم منشی محمد شبیر حسین نسیم[2] بھرتپوری تلمیذ داغ کا قطعہ تاریخ

مثنوی وہ مرے استاد کی ہے
جس کا ثانی ہی نہیں ہے ممکن

---

[1] "داغ دہلوی" کے بعد الگ سے ذرا اوپر کاتب نے باریک قلم سے "مرحوم" تحریر کر دیا ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مثنوی کی کتابت پانچویں ایڈیشن کے لیے ہو چکی تھی کہ داغ کے انتقال کی خبر آئی ۔ اس سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مثنوی پانچویں بار ۱۹۰۵ء میں چھپی تھی

[2] نسیم بھرتپوری ۱۸۶۱ء تا ۱۹۰۹ء

ختم کا سال لکھا مَیں نے نسیم
تحفۂ شاعرِ قدسی باطن

۱۳۰۰ھ

سوم زیدی (حاشیہ ۲۲۲) لکھتے ہیں :

"فریادِ داغ کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ یہ ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت کا سنہ ۱۳۰۰ھ ہے لیکن کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ اس پر ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے جو غالباً داغ کی ہے۔ اس مخطوطے میں مثنوی کے آخر میں دو شعر جو تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں پائے جاتے ہیں، نہیں ہیں ۔۔۔ یہ شعر مندرجہ ذیل ہیں ؎

یا الٰہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے "

اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوجاتا کہ مثنوی ۱۳۰۰ھ میں لکھی گئی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مثنوی کی پہلی روایت میں آخری دو شعر کم تھے۔ غالباً ان کا اضافہ مثنوی کی طباعت کے وقت کیا گیا۔ اب یہ کہنا کہ یہ اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ میں چھپ گئی قطعی غلط ہے۔

"آفتِ دین فتنہ آرائی" سے ۱۳۰۰ھ نہیں ۱۳۰۲ھ برآمد ہوتا ہے (بحث آگے آئے گی)

۲۔ یہ غلط ہے کہ پہلے ایڈیشن کے بعد مختلف مطبعوں نے اس مثنوی کے متعدد ایڈیشن

چھاپے کیونکہ پانچویں ایڈیشن کے آخر میں اعلان ہے کہ "چونکہ حقِ تصنیف مثنوی ہذا جناب مصنف (داغ) نے راقم نیر اعظم کو ہبہ فرمایا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس لیے کوئی صاحب بغیر اجازتِ تحریری راقم چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں" یہی وجہ ہے کہ پانچوں کے پانچوں ایڈیشن مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد ہی سے چھپے کسی اور مطبع سے نہیں۔

۳۔ یہ کہ پہلے ایڈیشن میں پندرہ سو جلدیں چھاپی تھیں، اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو داغ نے (شاید ۱۳۰۲ھ میں) اپنی معشوقہ حجاب کو لکھا تھا ۔ دیکھیے زبانِ داغ ص ۱۸۹/۹۰ لکھتے ہیں۔

"مثنوی تمہاری تھی، تمہارے حال کی تھی، تمہارے صفات کی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ صاحبِ مطبع نے پندرہ سو چھاپی تھیں مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں۔ مکرر چھپیں گی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

۴۔ یہ دوسری مرتبہ یعنی ۱۳۰۲ھ کی طباعت کے لیے محمد فیروز شاہ خاں فیروز[1] کے قطعے کو دلیل بنایا گیا ہے، مگر پانچویں ایڈیشن میں اس قطعے کا عنوان کچھ اور کہتا ہے۔

"قطعہ تاریخ طبع مثنوی فریادِ داغ بار اوّل ریختہ کلک ۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ منشی فیروز شاہ خاں صاحب فیروز ۔۔۔۔۔

رام پور شاگردِ رشید حضرت داغ دہلوی ۔۔۔۔۔۔۔"

گویا تاریخ "نظم دردمندی" (۱۳۰۲ھ) مثنوی کی پہلی اشاعت کے لیے کہی

---

[1] متوفی ۱۴ اگست ۱۹۰۰ء

گئی تھی۔ پانچویں ایڈیشن میں تین تاریخی قطعات ۱۳۰۲ھ کے ہیں اور پھر تیسری اور چوتھی اشاعت کے لیے قطعاتِ تاریخ ہیں۔ اب اگر داغ کے خط بنام حجاب پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پندرہ سو جلدیں مہینہ بھر میں نکل گئی تھیں اور مثنوی کو "مکرر" چھاپا جانے والا تھا اور بہت جلد چھاپ بھی دیا گیا ہوگا۔ اس طرح قیاس کرنا چاہیے کہ مثنوی ۱۳۰۲ھ میں دو بار چھپی۔ پہلی بار ۱۳۰۲ھ میں اور دوسری بار بھی اسی سال میں۔

۱۳۰۲ھ کا تیسرا قطعۂ تاریخ امیر اللہ تسلیم کا ہے جو یوں ہے۔

تاریخِ طبع از جناب منشی امیر اللہ
تسلیم ملازم سرکار رام پور

چو شد مطبوع ایں افسانۂ عشق
ز فکرِ ماہرِ عامی مقامے
نوشتم مصرعۂ تاریخ تسلیم
کلامِ شاعرِ شیریں زبانے

۱۳۰۲ھ

۵۔ تیسری مرتبہ ۱۳۱۳ھ میں نہیں بلکہ ۱۳۱۲ھ میں چھپی۔ فیروز کے مصرعے "مثنوی یہ ہے یا کُل تر ہے" سے ۱۳۱۲ھ (۶ جولائی ۱۸۹۴ء) تا ۲۴ جون ۱۸۹۵ء) مستخرج ہوتے ہیں۔ تیسری طباعت کے لیے ایک قطعۂ تاریخ اشفاق علی خاں مضطر مراد آبادی منصرم نیرِ اعظم کا بھی ہے ؎

ک۔ ولادت ۲۰/۱۸۱۹ء وفات ۲۷ مئی ۱۹۱۱ء

چھپ گئی پھر مثنوی وہ حضرتِ استاد کی
دیکھنے کا جس کے مضطر اک جہاں مشتاق تھا
فکر تھی تاریخ لکھوں طبع کی میں ناگہاں
غیب سے آواز آئی ارمغانِ بے بہا

۱۳۱۲ھ

۶۔ تیسری اشاعت کے بعد مثنوی "متعدد" بار شائع ہوئی کہ نہیں یہ تو فی الحال ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ داغ کی زندگی میں ایک ہی مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد سے پانچ بار چھپی۔ پانچویں بار اس طرح کہ مثنوی کی کتابت ہو چکی تھی اور داغ کا انتقال ہو گیا۔ خاتمے کی تمام عبارت میں داغ کو زندہ دکھایا گیا ہے۔ مگر پریس میں جاتے جاتے "داغ دہلوی" پر الگ سے چھوٹا سا "مرحوم" بھی کتابت کرنا پڑا جو قطعی کاتبِ مسودہ کے قلم سے ہٹ کر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ داغ کے انتقال کی خبر آتے ہی ایسا کیا گیا ہوگا۔

میرے کتب خانے کے پانچویں ایڈیشن کے آخر میں متن کے بعد ذیل کے تاریخی قطعے اور تقریظیں درج ہیں۔ اُن کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں:

(۱) "قطعۂ تاریخِ طبع از نتیجۂ فکرِ رسا و سلیم منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی"،
کل اشعار بزبانِ فارسی ۱۹۔ آخری مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے۔ یہ ہے۔ آفتِ دین فتنہ درائی۔

پانچویں ایڈیشن میں سہوِ کاتب سے آرائی کی جگہ رعنائی چھپ گیا ہے۔ رعنائی سے تاریخ قطعی غلط ہو جاتی ہے۔

(ب) "تاریخِ مثنوی نتیجۂ طبع جناب منشی شبیر حسین صاحب نسیم بھرتپوری تلمیذ حضرت مصنف ممدوح"

کل ۲ شعر بزبانِ اُردو۔ دوسرا شعرے ختم کا سال لکھا مَیں نے نسیم
تحفۂ شاعرِ قدسی باطن

۱۳۰۰ھ

(ج) "تاریخِ طبع از جناب منشی امیر اللہ صاحب تسلیم ملازم سرکار رام پور"
کل ۲ شعر بزبانِ فارسی۔ پہلا مصرعہ "چو شد مطبوع ایں افسانۂ عشق"
چوتھا مصرعہ "کلام شاعرِ شیریں زبانے" (۱۳۰۲ھ)

(د) "ریختۂ قلم منشی فاضل شیخ غلام قادر صاحب گرامی تخلص ملازم ریاست حیدرآباد دکن"۔
کل ۲۵ شعر بزبانِ فارسی۔ پہلا شعرے بیالے بلبل کلکِ خوش آہنگ
بمدحِ داغ سر کُن نغمۂ چنگ

آخری شعرے بنا بد از زبانِ نکتہ پرور
گرامی[1] مدحتِ داغِ سخنور

ان ۲۵ اشعار کا تعلق مثنوی سے قطعی نہیں۔ یہ تمام شعر داغ بحیثیت شاعر کی تعریف میں ہیں۔ اس لیے ان میں کوئی تاریخی مادّہ نہیں۔ گرامی میر محبوب علی خاں نظام دکن کے عہد میں حیدرآباد آئے تھے۔ یہ اشعار اسی زمانے ۸۵/۱۸۸۴ء کے فکر کردہ ہو سکتے ہیں مگر اُس وقت تک داغ حیدرآباد نہیں پہنچے تھے۔

(ھ) "قطعہ و تاریخ طبع مثنوی فریادِ داغ بار اوّل، ریختۂ کلکِ جواہر سلک شاعر عدیم المثال، مورّخِ باکمال جناب منشی محمد فیروز شاہ خاں صاحب فیروز سابق میر اخبار رپورٹر وارن اخبارات ریاست رام پور شاگردِ رشید حضرتِ داغ دہلوی مدظلہ العالی"۔
کل ۲ شعر بزبانِ اردو۔ آخری ترکیب نظمِ دردمندی (۱۳۰۲ھ) سے تاریخ

---

[1] ولادت ۱۸۵۷ء وفات ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء

نکلتی ہے۔

(و) "ایضاً بار سوم"

کل ۲۲ شعر بزبانِ اُردو۔ پہلا شعر ہے اوستادِ جہاں فصیح الملک
وصف تیرا ہر اک زبان پر ہے

آخری شعر ہے میں نے تاریخ یہ کہی فیروز
مثنوی یہ ہے یا گل تر ہے

۱۳۱۲ھ

(ز) "قطعہ تاریخ طبع زاد جناب منشی اشفاق علی صاحب مضطر مرادآبادی منصرم بیر اعظم"
کل ۲ شعر بزبانِ اُردو۔ پہلا مصرعہ ہے چھپ گئی پھر مثنوی وہ حضرتِ استاد کی

آخری مصرعہ ہے غیب سے آواز آئی "ارمغانِ بے بہا"

(۱۳۱۲ھ)

(ح) "تقریظ نتیجۂ ذہن آسماں پیمائے منشی محمد ممتاز علی خاں صاحب ممتاز شاگردِ رشید حضرت مصنف سلمہا اللہ تعالیٰ"۔
یہ نثر کا ڈیڑھ صفحہ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ نمونۂ کلامِ نثر یہ ہے۔

"اللہ رے طلاقت۔ واہ ری فصاحت۔ مصرعہ ہے کہ ابروئے
دلدار۔ شعر ہے کہ معشوق کا سنگھار۔ طبیعت میں بلا کی روانی۔
ذہن میں ستم کی جولانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

(ط) "تقریظ مثنوی چکیدۂ کلک جناب حافظ احمد علی خاں شوق رئیس رام پور تلمیذ حضرتِ داغ"۔

یہ آدھے صفحے کی نثری تقریظ ہے۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے داغ کی زندگی میں اعلانیہ داغ کی ولدیت کا اظہار کیا ہو۔ چنانچہ تقریظ میں لکھا ہے۔

"۔۔۔۔ مثنوی حضرتِ عالی جناب فیض مآب بلبلِ ہندوستان
استاذی جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مدظلہ العالی
خلف عالی جناب نواب محمد شمس الدین خاں صاحب بہادر
دہلوی موسوم بہ فریادِ داغ طبع ہو چکی۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

(ی) "تاریخ طبع چہارم نتیجۂ فکر شاعرِ نامور میرزا احمد شاہ [بہ تخلص جوہر] تلمیذ حضرت تسلیم سہسوانی مرحوم مغفور"

کُل ۲ شعر ۔ طبع شد فریادِ داغ اے شایقانِ نکتہ سنج
با ہزاراں زیب و زینت با ہزاراں دلبری
خامۂ جوہر رقم زد از پئے تاریخ طبع
بار چارم طبع شد ایں ہوش افزا مثنوی

= ۱۸۹۹ء

(۱۸ شعبان ۱۳۱۶ھ تا ۲۸ شعبان ۱۸۱۷ھ)

(ک) "خاتمۃ الطبع" جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے، اس پانچویں ایڈیشن کا خاتمۃ الطبع کتابت کیا جا چکا تھا کہ داغ کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا مالکِ مطبع نے "داغ دہلوی" کے اوپر باریک قلم سے مرحوم لکھ دیا یا لکھوا دیا۔ حالانکہ تمام خاتمے کی باقی نثر سے ظاہر ہے کہ داغ بقیدِ حیات ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ اس کا شاہد ہے۔

"اب جو اہلِ کمال وہاں کے موجود ہیں ان میں سے جناب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کی ذات مغتنمات سے سمجھی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اسی خاتمے میں درج ہے کہ

"فی الحال پانچویں بار مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد
میں چھپ کر نذرِ شائقین ہوئی ہے ...."

(۱) پانچویں ایڈیشن کی آخری تین سطروں میں درج ہے۔

"چونکہ حقِ تصنیف مثنوی ہذا جناب مصنف نے راقم نیر اعظم کو
ہبہ فرمایا لہذا ....
کوئی صاحب بغیر اجازتِ تحریر راقم کے چھاپنے کا قصد نہ فرمائیں
ورنہ نقصان اٹھاویں گے
احمد ایس۔ بن علی مالک و ایڈیٹر اخبار نیر اعظم مراد آباد"

مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ • مثنوی دو دن میں لکھی گئی۔ سال ہجری ۱۳۰۰ھ تھا

- پہلی روایت میں مروجہ مثنوی کے آخری دو شعر نہیں تھے۔ بعد بوقتِ طباعت اضافہ کیے گئے
- طباعت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی اور پہلے ہی سال میں دو ایڈیشن نکلے
- پہلے ایڈیشن میں پندرہ سو جلدیں چھاپی گئی تھیں جو مہینہ بھر میں فروخت ہو گئیں
- داغ کی زندگی میں اس مثنوی کے پانچ ایڈیشن نکلے۔ (پانچویں ایڈیشن کا کتابت شدہ مواد پریس میں جانے والا تھا کہ داغ کا انتقال ہو گیا)
- یہ سب ایڈیشن مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد سے شائع ہوئے کیونکہ حق تصنیف داغ نے صرف اسی مطبع کو ہبہ کیا تھا

۱۔ باوجود کوشش کے مجھے مثنوی کے پہلے دو ایڈیشن دستیاب نہیں ہو سکے۔ ہو سکتا ہے اُن کے خاتمے کی عبارتوں کی روشنی میں مجھے اپنے نتائج میں کچھ رد و بدل کرنا پڑے

فنِ شعر میں داغ کے آباو اجداد

بعض کی رائے میں ولی دکنی کبھی دہلی آئے ہی نہیں مگر بیشتر دانشور تسلیم کرتے ہیں کہ ولی ۱۱۱۲ھ (مطابق ۰۱-۱۷۰۰ء) میں دہلی تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنا کہا ہوا کلام بیاض ہی کی شکل میں بھی لائے ہوں گے۔ اس تقدم اُردو کلام سے خاص و عام محظوظ ہوئے اور فارسی کلام کی برتری کے رُعب سے نجات حاصل کر سکے۔ جب ولی کے انتقال کے بعد ۱۱۳۳ھ (مطابق ۲۱-۱۷۲۰ء) میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو اس سے دہلی میں اُردو شاعری کو بڑا حوصلہ ملا۔ اچھے اچھے اُردو شاعر پیدا ہوئے۔ اُن شاعروں میں ایک نامی شاعر شاہ حاتم تھے۔ یہی شاہ حاتم شعر میں داغ کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ ذیل میں داغ کے شعری آباواجداد کی فہرست دی جاتی ہے۔ فہرست میں تخلص، نام، سالِ ولادت، سالِ وفات اور استاد کے نام کے علاوہ نمونۂ کلام کے طور پر تین تین شعر بھی دیے گئے ہیں:

تخلص	نام وغیرہ	سالِ ولادت	سالِ وفات	استاد	اشعار
حاتم	شیخ ظہورالدین (معروف بہ شاہ حاتم)	۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹/۱۷۰۰ء	رمضان ۱۱۹۷ھ اگست ۱۷۸۳ء	کوئی استاد نہ تھا مگر خود لکھا ہے کہ "در ریختہ ولی را استاد می داند"	کعبہ و دیر میں حاتم بخدا غیرِ خدا کوئی کافر نہ کوئی ہم نے مسلماں دیکھا ——— نہیں صلے کی طمع مجھ کو اہلِ دولت سے میں سرفروش ہوں حاتم سخن فروش نہیں ——— پگڑی اپنی سنبھالے چلنا شیخ اور بستی نہ ہو یہ دلی ہے
سودا	مرزا محمد رفیع	۱۱۱۸/۲۰ھ ۱۷۰۶/۸ء	۴ رجب ۱۱۹۵ھ ۲۶ جون ۱۷۸۱ء	حاتم	گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی ——— تجھ قید سے دل ہو کر آزاد، بہت رویا لذت کو اسیری کی، کر یاد بہت رویا ——— عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

تخلص	نام وغیرہ	سالِ ولادت	سالِ وفات	استاد	اشعار
قائم[1]	محمد قیام الدین (عرف محمد قائم)	قیاساً ۱۱۳۵ھ ۲۳-۱۷۲۲ء	۱۲۰۸ھ ۹۴-۱۷۹۳ء	سودا	قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند کچھ دُور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا — چھُپ کے تیرے کوچے سے گزرا میں لیک نالہ اِک عالم کو خبر کر گیا — ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا ٹک دُور سے دیکھ جائیں گے ہم
مائل[2]	میر مہدی	۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء	۱۲۱۲ھ ۹۸-۱۷۹۷ء	قائم	تُو تو مجھ پر سحر کے غُصّہ ایک دم سوتا رہا شمع کے مانند ساری رات میں روتا رہا

۱ ۱۱۵۵ھ میں نواب محمد یار خاں ٹانڈہ کی سرکار سے وابستہ تھے

۲ سعی لبیار کے باوجود میر محمدی مائل کے سالہائے ولادت و وفات کا علم نہ ہو سکا۔ اس لیے یہ دونوں سال قطعی قیاسی ہیں۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ ان کا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔ تاریخِ ترتیب کا قطعہ یہ ہے ؎

ہوا دیواں مراجب صاف اللہ کی عنایت سوں ؛ شگفتہ دل ہوا پڑھ ریختہ ارباب محفل کا

میں سر نوڑائے بیٹھا تھا پے تاریخ زانو پر ؛ کہا تاریخ ہاتف نے کھُلا ہے باغ مائل کا

فقرۂ تاریخ میں مائل میں ہمزہ کو 'ی' مان کر ۱۰ عدد لیے جائیں تو ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتا ہے دلسانی مطالعے از ڈاکٹر گیان چند ص ۶۲)

تخلص	نام وغیرہ	سالِ ولادت	سالِ وفات	استاد	اشعار
					جب تری بندگی میں آتے ہیں سب خدائی کو بھول جاتے ہیں ——— آتا ہے دم بدم یہی رونا یہاں مجھے پھینکا فلک نے ہائے کہاں سے کہاں مجھے
نصیر[۱]	میاں نصیرالدین (معروف بہ شاہ نصیر)	۱۱۷۴ھ ۶۱-۱۷۶۰ء	۲۵ شعبان ۱۲۵۴ھ ۲۳ نومبر ۱۸۳۸ء	مائل	وہ مے پیے گر چشم بہ دریا میں تو ساقی! بن جائے حبابوں سے بھی دریا ہمہ تن چشم! ——— کدھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سردِ زمانہ مجھ کو دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں ——— ہے یہ تمنا یہ جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں ہاتھ میں ساغر بر میں مینا، سر پہ طرہ بانکے میں
ذوق	شیخ محمد ابراہیم	۱۲۰۳ھ ۸۹-۱۷۸۸ء	۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء	نصیر	مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا، نہیں آتا

۱؎ شاہ نصیر کا سال ولادت معلوم نہیں۔ یہاں محض قیاس سے کام لیا گیا ہے

تخلص	نام وغیرہ	سالِ ولادت	سالِ وفات	استاد	اشعار
					اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس مہجور کا دل نہ اٹکا وے کہیں اللہ ہے مقدور کا ——— رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے مژدہ خارِ دشت ـ پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
داغ [1]	نواب مرزا خاں	۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء	۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء	ذوق	

[1] راقم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے یعنی داغ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد جوش ملسیانی (ولادت یکم فروری ۱۸۸۳ء وفات ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء) مرحوم جوش صاحب کے شاگردوں میں سے ایک میں یعنی راقم الحروف (ولادت ۲۵ اگست ۱۹۲۵ء)

داغؔ اور تاریخ گوئی

مطالعۂ داغؔ[1] میں درج ہے کہ داغؔ کے قطعاتِ تاریخ کی تعداد ۱۰۹ ہے جو ۷۹۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ تمام قطعات مطبوعہ ہیں۔

"گلزارِ داغ میں ۲، مہتابِ داغ میں ۷۳، اور یادگارِ داغ میں ۳۴ ———————————— "

تاہم ان کے علاوہ بھی داغؔ کے مطبوعہ قطعاتِ تاریخ کہیں نہ کہیں دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ اس لیے میرا اندازہ ہے کہ اگر کاوش کر کے زیادہ سے زیادہ قطعات یکجا کیے جاسکیں تو تعداد بآسانی سوا سو تک پہنچ سکتی ہے۔ "فریادِ داغ" (مثنوی) خود تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۰۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ داغؔ کی والدہ چھوٹی بیگم ۱۸۴۴ء میں مرزا فخرو، ولی عہدِ شاہِ دہلی سے وابستہ ہو کر لال قلعہ میں داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے ۱۸۴۵ء میں داغؔ کو بھی قلعے میں بلوالیا۔ داغؔ یہاں چندے مرزا فخرو

---

[1] مطالعۂ داغ از ڈاکٹر سید محمد علی زیدی ص ۲۵۳

سے اصلاح لیا کیے پھر مرزا فخرو نے انہیں ذوق کا شاگرد کرا دیا۔ داغ تخلص ذوق ہی کا عطا کردہ ہے۔ داغ نے اسی سال یعنی ۱۸۴۵ء میں دو نامی مشاعرے پڑھے۔ ایک نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے یہاں اور دوسرا زینت بارٹی میں۔ جن میں انہیں خوب داد ملی۔ یہ سب کچھ استاد کی ایک ہی سال کی توجہ سے تو نہیں ہو گیا ہوگا۔ وہ کئی برس پہلے سے (شاید نو دس سال کی عمر سے) شعر کہتے رہے ہوں گے اور ۱۸۴۵ء میں جب کہ ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی، مشق سخن اور بھی تیز ہو گئی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ ۱۶ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۴۷ء تک اُن کے پاس غزلوں کا اچھا ذخیرہ جمع ہو چکا ہوگا اور اُن کی چلبلی طبیعت سے بعید نہیں کہ انہوں نے اسی سال ایک ناپختہ دیوان بھی ترتیب دے لیا ہو اور اس کا نام "گلزارِ سخن" رکھ دیا ہو۔ یہ تاریخی نام ہے یعنی ۱۲۶۳ھ (مطابق دسمبر ۱۸۴۶ء تا نومبر ۱۸۴۷ء) ہو سکتا ہے یہ وہی دیوان ہو (جس میں مزید غزلیں بھی جمع ہوتی رہی ہوں گی) جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گیا تھا۔ پہلا دیوان جب دوبارہ تیار ہوا تو حافظے سے اس میں تلف شدہ دیوان کی پرانی غزلیں بھی شامل کر لی گئیں مگر نام وہی "گلزارِ داغ" رہنے دیا۔ چونکہ ۱۲۶۳ھ کو گزرے زمانہ ہو گیا تھا اس لیے مطبوعہ دیوان پر "گلزارِ داغ" کے نیچے، تاریخی سال نہیں دیا گیا مگر نام وہی رہا۔

تمکین اعظمی[۱] لکھتے ہیں[۲]۔

> "داغ استاد ضرور تھے مگر فنِ تاریخ گوئی میں انہیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں تھی کیونکہ انہیں حساب سے دلچسپی نہ تھی اس لیے تاریخیں بھی اچھی نہ نکل سکتی تھیں ———— "

۱۔ سید محمد تمکین تمکین اعظمی ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء تا ۲۷ مئی ۱۹۶۱ء

۲۔ نواب مرزا خاں داغ ص ۱۲۰

ڈاکٹر سید محمد علی زیدی جو داغ کی مہارتِ تاریخ گوئی کے بڑے قائل ہیں، لکھتے ہیں[۱]

"تمکین اعظمی کی اس رائے میں کوئی وزن معلوم نہیں ہوتا . . ."

مگر ان دونوں کے برعکس داغ کے ایک برگزیدہ شاگرد کی رائے بہت اہم ہے۔ یہ رائے ان دونوں سے متفق بھی ہے اور الگ بھی۔ میری مراد شمس العلماء خان بہادر احمد عبد العزیز عزیز جنگ ولا حیدرآبادی[۲] سے ہے۔ وہ اپنی تصنیف "غرائب الجمل"[۳] میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے استاد مغفور فصیح الملک داغ دہلوی اگرچہ فنِ جمل میں بڑے پایہ کے شخص نہ تھے اور وہ خود ہماری ہر ایک تاریخ کی اصلاح کے وقت اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے لیکن سبحان اللہ زبان کے متعلق آپ کی اصلاح کا کیا کہنا۔ آپ نے ہمارے بعض اُن مادہ ہائے تاریخ کو کاٹ کے پھینک دیا جن کی ترکیب میں مبتدا سے خبر دور پڑی ہوئی تھی اور ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ حُسنِ کلام یہ ہے کہ مبتدا سے خبر بہت قریب ہو۔ ہمارے بعض تاریخی مادوں کی ترکیب آپ نے پلٹ دی اور ان کی رونق دوبالا فرما دی اور تعقیدِ الفاظ کے آپ ہمیشہ مخالف رہا کرتے تھے۔

آپ کی تاکید تھی کہ بامحاورہ الفاظ کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۔ مطالعۂ داغ ص ۲۵۸

۲۔ ولا حیدرآبادی شاگردِ داغ ۲۸ دسمبر ۱۸۶۰ء تا ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء

۳۔ غرائب الجمل مطبوعہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء
۱۳۱۷ فصلی

اس لیے کہ خوبی زبان کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ آپ فرماتے
تھے کہ عمدہ مضامین نقصانِ زبان کی وجہ سے خاک میں مل
جاتے ہیں اور کم درجہ کا مضمون بھی خوبیِ زبان کے ساتھ چمک
اُٹھتا ہے۔

آپ ہی کا قول تھا کہ اگر کسی مادہ میں زبان کی خوبی ہو اور
صاحبِ واقعہ کا نام نہ آسکے تو ایسا مادہ اُس مادہ پر فائق ہوگا
جس میں صاحبِ واقعہ کا نام تو ہو مگر زبان کا لحاظ نہ کیا گیا ہو"[1]

اسی کتاب سے ولاؔ حیدرآبادی کا ایک بیان اور ملاحظہ کیجیے۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ ہوئی، چھوئی اور ہوئے، چھوئے کے ۲۱ عدد شمار کیے جائیں یا ۳۱۔ فرماتے ہیں۔

"استادی داغؔ مغفور سے ہم کو اس کے متعلق گفتگو کا موقع
ملا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ دونوں جائز ہیں۔ خواہ اِن الفاظ کو
ایک 'یا' سے لکھو یا دو 'یا' سے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے (ہوئی)
کا رسم الخط اکثر دو 'یا' سے دیکھا ہے اور (ہوئے) کی کتابت
دونوں طرح پر۔ پھر آپ ہی نے فرمایا کہ ہم نے اپنی ایک تاریخ
میں لفظ (ہوئے) کے اعداد (۲۱) محسوب کیے ہیں لیکن آیندہ
تاریخوں میں دو 'یا' کے پابند رہیں گے[2]۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اِن دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ
(۱) داغؔ کے نامور شاگرد بھی استاد داغؔ کو فنِ تاریخ گوئی میں بڑے

۱۔ عرائب الجمل ص ۱۸۰
۲۔ عرائب الجمل ص ۱۲۷

پایہ کا شخص نہیں جانتے تھے

(۲) داغ تاریخی مادوں میں خوبیِ زبان کو خوبیِ مضمون سے مقدم قرار دیتے تھے

(۳) داغ کو تاریخ گوئی کے اصولوں پر استادانہ عبور حاصل نہ تھا، دوسرے اقتباس سے عیاں ہے کہ وہ آخر عمر تک ہوئی اور ہوئے وغیرہ الفاظ کے اعداد حتمی طور پر طے نہیں کر پائے تھے

تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُن کے کہے ہوئے تاریخی مادے بیشتر مضبوط، بامعنی، بامحاورہ اور بغیر تعمیہ اور تخرجہ کے ہوتے تھے مثلاً

راجا گردھاری پرشاد باقیؔ کے دوسرے بیٹے کی وفات پر

آہ باقیؔ کو ہوا اب دوسرے بیٹے کا داغ

۱۸۸۸ء

کلیات منیرؔ کے طبع ہونے پر

آفتابِ منیرؔ و بدرِ منیر

۱۲۹۶ھ

منشی نجیب الدین کی تصنیف واسوخت کی تاریخ

ہوا جلنے جلانے کا یہ واسوخت

۱۳۰۸ھ

شاہزادے کی ولادت پر

چاند سا بیٹا مبارک اے شہِ کیواں مکاں

۱۳۰۵ھ

نظّام کے ہنمکنڈے سے واپس آنے کی تاریخ

ہنمکنڈے سے آگئے اب حضور

۱۳۰۷ھ

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ داؔغ فنِ تاریخ گوئی پر عبور بھلے ہی نہ رکھتے ہوں مگر صحیح مادّہ ڈھونڈ نکالنے پر قادر تھے۔

لے غرائب الجمل ص ۷۵ پر ہنمکنڈے کے بجائے ہنمکنڈہ ہے۔ اس سے ۵ عدد کم ہو گئے ہیں۔ اس لیے ولاؔ حیدرآبادی نے سال ۱۳۰۲ھ لکھ دیا ہے۔ تاہم میری رائے میں ہنمکنڈے ہی ہونا چاہیئے۔ یعنی ۱۳۰۷ھ کیونکہ داؔغ ۱۳۰۲ھ تک حیدرآباد نہیں پہنچے تھے

داغ اور غالب

غالب کی اہلیہ امراؤ[1] بیگم کے والد مرزا الٰہی بخش خاں معروف[2] اور نواب شمس الدین احمد خاں[3] کے والد نواب احمد بخش خاں[4] سگے بھائی تھے۔ مرزا داغ[5]، شمس الدین احمد خاں کے بیٹے تھے۔ یعنی امراؤ بیگم، داغ کی پھوپھی تھیں اور غالب اُن کے پھوپھا۔ اس طرح یہ جو تمکین کاظمی نے لکھا[6] ہے کہ :

"اگر داغ کو ابتدا ذوق کا تلمذ اور اس کے بعد غالب کی ہم نشینی نصیب نہ ہوتی تو وہ داغ نہ بن سکتے تھے ---------"

تو کچھ غلط نہیں لکھا ہے۔ جب ذوق کا انتقال ہوا ہے، داغ صرف ۲۳ سال کے تھے۔ اسی کے بعد وہ زمانہ شروع ہوا جس میں غالب نے داغ پر لگ بھگ اڑھائی سال تک توجہ کی۔ اس دوران میں ۱۰ جولائی[7] ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔

---

[1] ولادت ۱۷۹۹ء؟ [2] ولادت آخر ۱۷۷۶ء؟ [3] ولادت ۱۸۰۹ء [4] ولادت ۱۷۶۵ء
[5] ولادت ۱۸۳۱ء [6] مرزا تان داغ۔ ص ۴۰ [7] ۱۶ نومبر ۱۸۰۲ء

انھی چند روزوں کے لیے داغ، غالب کے فیض سے محروم رہے ہوں گے، ورنہ انہوں نے متواتر غالب سے استفادہ کیا۔ حتیٰ کہ آخر ۱۸۶۵ء میں داغ، نواب یوسف علی خاں کے دامنِ عاطفت میں رام پور چلے گئے[1] اگرچہ وہ رام پور سے دہلی آتے جاتے رہے اور کبھی کبھی دہلی میں طویل قیام بھی کرتے رہے تاہم اُن کا غالب سے فیض پانے کا زمانہ وہی تھا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

تمکین کاظمی نے لکھا ہے کہ ذوق کے انتقال کے بعد

"داغ نے زیادہ وقت غالب کے پاس گزارنا شروع کیا۔ غالب، داغ سے شطرنج کھیلتے۔ اپنی طرح کی ہوئی زمینوں پر غزلیں کہلواتے اور سُن کر خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ داغ اپنے شاگردوں کو ایسے قصّے سنایا کرتے تھے جن سے غالب کی توجہ ظاہر ہوتی تھی ------------"

یادگارِ غالب[2] میں حالی نے لکھا ہے کہ غالب

"ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے:

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے --"

مگر یہ بیان داغ سے زیادہ غالب کی تعریف میں ہے۔ اس سے حالی نے یہ کہنا چاہا ہے کہ شعر کسی کا بھی ہو اگر اچھا ہے تو غالب داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

۱؎ مرزا خاں داغ۔ ص ۳۸

۲؎ یادگارِ غالب (حصہ اردو)۔ حالی، مرتبہ مالک رام۔ ص ۹۴

احسن مارہروی نے جو کچھ اس ضمن میں لکھا ہے (اور وہ سب داغ کی اجازت سے لکھا ہے) وہ البتہ اہم ہے۔ کہتے ہیں[1]۔

"حضرت غالب جیسے اکھل کھرے مزاج کے آدمی کو کون نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔ سنا گیا ہے کہ منجملہ اور اشعار کے حضرت استاذی کے یہ چار شعر بھی اکثر پڑھا کرتے تھے۔ وہ اشعار یہ ہیں [ان میں سے ایک شعر وہی ہے جو حالی نے درج کیا ہے یہاں اسے حذف کر دیا ہے] ؎

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر
دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

افتادگی یہ بھی نہ گئی ہم اس کی جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں
کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں"

نثار علی شہرت رقم طراز ہیں[2]

"ایک روز میں غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔ میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے؟ فرمانے لگے۔ ایسی عمدہ کہ کیا کسی کی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو

---

[1] آئینۂ داغ۔ ص ۱۵۲ [2] آئینۂ داغ۔ ص ۳۴

اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ تعلیم
دے رہا ہے ...."

مَیں ایک مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس بیان کے آخری حصّے کے الفاظ غالب کے نہیں ہیں البتہ مفہوم غالب ہی کے بیان کا ہو سکتا ہے جسے شہرت نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ تاہم زبان کے متعلق داغ کی تمدارت... کا یہ صحیح اعتراف ہے اور یہ اعتراف غالب کی زبان سے ہو تو اس کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

غالب کی طرح داغ نے بھی، کلکتے کا سفر کیا[۱]۔ جو اپریل ۱۸۸۲ء سے شروع ہو کر ۲ جولائی ۱۸۸۲ء کو ختم ہوا۔ دونوں کا سفر خاص مقاصد کے حصول کے لیے تھا اگرچہ مقاصد کی نوعیت الگ تھی۔ غالب اپنی تخفیف شدہ پینشن کی بحالی کے لیے اپیل کرنے گئے تھے اور داغ، اپنی کوٹھے والی معشوقہ مُنّی بائی حجاب کے حصول کے لیے۔ تمکین کاظمی لکھتے ہیں[۲]:

"غالب نے بھی کلکتہ کا سفر کیا مگر وہاں جا کر جھگڑے کھڑے
کر دیے اور دوستوں کو دشمن بنا لیا۔ بخلاف ان کے داغ
نے کلکتہ پہنچ کر دشمنوں کو بھی دوست بنا لیا........"

یہ تجزیہ قطعاً غلط ہے۔ غالب جب کلکتہ گئے ہیں تو تیس بتیس[۳۲] سال کے تھے اور

۱؎ بلکہ تین سفر کیے تیسرا سفر دسمبر ۱۸۹۹ء میں نظام حیدرآباد کی ہم رکابی میں کیا مگر وہ چنداں اہم نہیں کیونکہ وہ شاہی سفر تھا اور اس میں داغ اٹکھیلیاں کرنے کے لیے آزاد نہیں تھے۔ پرانے ملاقاتیوں سے ضرور ملے مگر حجاب سے نہ مل سکے کیونکہ وہ کسی سے نکاح کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ پہلا سفر ۳۳ سال پہلے دسمبر ۱۸۶۶ء میں نواب رام پور کی دربارداری کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ اصل خود مختارانہ سفر وہی ہے جس کا بیان اوپر ہوا ہے

۲؎ مرزا خاں داغ۔ ص ۹۷

داؔغ اِس سفر کے وقت پچاس سے تجاوز کر چکے تھے۔ داؔغ کی نسبت غالبؔ کا دماغ بہت غائر تھا اس لیے غالبؔ کی ٹکّر ہمیشہ اساتذہ و عُلمائے وقت کے ساتھ رہی، اس کے برعکس داؔغ نے ہمیشہ ایسے ٹکراؤ سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ البتہ دنیاداری میں دونوں کی ذہانت اعلیٰ درجے کی تھی۔ داؔغ کو معلوم تھا کہ زبان و بیان و فن میں اُن کا کوئی حریف نہیں مگر ادب کی عالمانہ سطح پر وہ بہتوں سے پیچھے ہیں۔ (اگرچہ اس کوچے میں بھی وہ ایسے ہیٹے نہ تھے) اِس لیے اُنہوں نے کبھی اپنے آپ کو علمی ادبی مباحث میں نہیں اُلجھایا۔ لہٰذا وہ کلکتے میں صرف دوست ہی بنا سکتے تھے، دشمن بنانے کے امکانات ہی کہاں تھے۔ غالبؔ نے وہاں جاکر دشمن بنائے نہیں بلکہ وہ کم و بیش کلکتے میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ قتیؔل کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ چنانچہ مشاعروں میں غالبؔ کو نیچا دکھانے کی کوشش کی گئی۔ پینشن کی اپیل کو ناکامیاب بنانے کے لیے مرزا افضل بیگ (سفیر شاہِ دہلی)، وہیں رہتے تھے۔ اس مقدمے میں وہاں فریقِ ثانی کے صفِ اوّل کے حمایتی وہی تھے۔ اس لیے غالبؔ کو دشمن بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوست بنانے میں غالبؔ اور داؔغ کو لگ بھگ ایک ہی سطح پر رکھنا پڑے گا۔ فرق سب حالات کا ہے۔

داؔغ کو بھی غالبؔ کی طرح آموں کا بہت شوق تھا[1]۔ کہا ہے

آم تخمی پسند ہے ہم کو
اس کو ہم پلپلا کے کھاتے ہیں

تمکینؔ کاظمی لکھتے ہیں کہ ۱۸۹۳ء میں جب حیدرآباد میں آم کی فصل کم ہوئی تو داؔغ نے حُسنِ طلب میں دو رباعیاں والیِ دکن کے حضور میں کہہ کر گزرانیں۔ شاہِ دکن

---

[1] مرزا خاں داؔغ۔ ص ۲۴۹

نے داغ کو آموں سے سرفراز فرمایا۔ شکریے میں داغ نے ۲۲ شعر کا قطعہ کہہ کر پیش کیا۔ آم کی صفت میں چند شعر ملاحظہ کیجیے ؎

کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ ؛ داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
سرخ میں ہے لالہ رُخوں کی بہار ؛ سبز میں ہے سبزہ خطوں کی پھبن
زرد میں ہے رنگِ گلِ زعفران ؛ کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
آم کے منہ پر ہے سیاہی کہ ہے ؛ مردمکِ چشمِ بتِ سحر فن

سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ ؛ منہ پہ مگر اُن کے ہے مُشکِ ختن
رنگ ہے وہ شوخ کہ جیسے پری ؛ اور وہ خوشبو کہ معطر دہن
گر کبھی ان آموں کا رس چوس لیں ؛ ہونٹ بھی چاٹا کریں شیریں دہن
ابنۂ شیریں جو اُسے ہو نصیب ؛ نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن

آموں کی صفت میں غالبؔ کی ۳۳ شعر کی مثنوی مشہورِ زمانہ ہے۔ اُس کے بھی چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ؛ خامہ، نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے ؛ ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے

نہ چلا جب کسی طرح مقدور ؛ بادۂ ناب بن گیا، انگور

مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے ؛ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ؛ جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

یا یہ ہوگا کہ فرطِ راحت سے :: باغبانوں نے بھر کے جنّت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربّ النّاس :: بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات :: مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل :: ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

اگرچہ مکاتیبِ غالبؔ میں داغؔ کا نام کہیں نہیں آتا تاہم اِس سے انکار ممکن نہیں کہ دربارِ رام پور میں غالبؔ، داغؔ کو اپنا ایک معتبر اور مضبوط معاون سمجھتے ہوں گے۔ زندگی میں ایسا کچھ ہوا ہو، اس کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔ البتہ غالبؔ کی وفات کے بعد کا ایک واقعہ اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں[۱]:

> میرزا [غالب] کی وفات کے بعد امراؤ بیگم پر گویا غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا .... انھوں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں [کلب علی خاں] کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپیہ میرزا مرحوم کا قرض باقی ہے۔ اس کی ادائی کے لیے مدد فرمائی جائے۔
> جب ایک ماہ تک اس درخواست پر کوئی حکم صادر نہ ہوا تو انہوں نے ۲ ستمبر ۱۸۶۹ء کو دوبارہ لکھا۔ اس پر ۹ ستمبر کو نواب میرزا خاں داغؔ کو تحقیق کر کے رپورٹ کرنے کا حکم ہوا۔ آخر کار نواب خلد آشیاں نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو حکم دیا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈی بھیج دی جائے ....۔"

ظاہر ہے کہ یہ چھ سو روپے کی ہنڈی (جو اس زمانے میں ایک خطیر رقم تھی) داغؔ

۱۔ ذکرِ غالبؔ۔ بارِ پنجم۔ ص ۱۴۱

ہی کی تحقیق کے نتیجے میں بھیجی گئی ہو گی اور یہ داؔغ نے کوئی احسان نہیں کیا تھا بلکہ اپنی پھوپھی کے تئیں اپنا فرض ادا کیا تھا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس قرابت داری، روز کی صحبتوں اور ذوؔق کے بعد رموز و غوامضِ شاعری سیکھنے کے نتیجے میں داؔغ نے غالبؔ سے کیا اثر قبول کیا؟ اس کے لیے سب سے پہلے تو ایک شعر کا قصہ سنئے جو اصل میں داؔغ کا تھا مگر پون صدی تک غالبؔ سے منسوب رہا۔

شاید اواخرِ مئی ۱۸۵۳ء ہو گا کہ شاہ ظفؔر نے اپنی طرف سے مصرع طرح دیا ؎

کوئی دشمن نہیں ہے اپنا دشمن آپ ہم نکلے

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کا یہ مشاعرہ ۳ جون ۱۸۵۳ء بروز جمعہ کو منعقد ہوا ہو گا۔ اس کے آثار تتمہ اردو اخبار مورخہ ۱۹ جون ۱۸۵۳ء میں ملتے ہیں۔ مشاعرے میں دیگر شعرا کے علاوہ شاہ ظفؔر، غالبؔ اور داؔغ کی غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ داؔغ کی یہ وہی غزل ہے جس کے درج ذیل شعر پر شاہ ظفؔر نے داؔغ کو اپنے پاس بلا کر اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا ؎

ہوئے مغرور وہ جو آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا سے بھرم نکلے

مدتوں بعد اس مشاعرے کے دو شعر، ایک شاہ ظفؔر کی غزل کا اور ایک داؔغ کی غزل کا، مولوی نظامی بدایونی کے غیر محتاط ہونے کی وجہ سے، کچھ تحریف کے ساتھ، غالبؔ کے کلام میں شامل ہو گئے ؎

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے (ظفؔر)

اور

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پرِ ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے (داؔغ)

جن کی اصل شکل یہ ہے ؎

خدا کے واسطے زاہد اُٹھا پردہ نہ کعبہ کا
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے (ظفر)

اور

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُرالم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے (داغ)

شاہ ظفر کے شعر کا علم تو جلد ہی ہو گیا مگر داغ کا شعر بدستور غالب کے کلام میں شامل رہا حتیٰ کہ اب (۱۹۹۴ء میں) میں نے دریافت کر کے پہلی بار بتایا کہ یہ شعر غالب کا نہیں داغ کا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں میں نے داغ کے جو سو شعر الگ سے انتخاب کر کے دیے ہیں اُن میں کا پہلا شعر یہی ہے جو غلط یا صحیح پون صدی تک بطورِ کلامِ غالب' محققوں اور نقادوں کا اعتماد حاصل کیے رہا۔

اب ذیل میں اس شعر سمیت سو شعر دیے جاتے ہیں جو میری دانست میں زبان و بیان کے لحاظ سے تو داغ ہی کے ہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے مخصوص رنگِ داغ سے مختلف ہیں اور غالب کے اسلوب سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اِن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ داغ اگر محض فکری شاعری کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے اور یہ بھی کہ فکری اور معنوی پرتوں والے شعر سادہ اور رواں دواں زبان میں بھی پوری تابناکی کے ساتھ کہے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

"گلزارِ داغ"

نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُرالم نکلے ؎ جو یہ نکلے تو دل نکلے' جو دل نکلے تو دم نکلے

جو راہ میں تیری آ کے بیٹھے وہ فکرِ دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا

کی ترکِ مے، تو مائلِ پندار ہو گیا ∴ میں توبہ کر کے اور گنہگار ہو گیا

سرشکِ تلخ کی تلخی گوارا ہے تو ہم کو ہے ∴ زمیں پیتی نہیں آنسو ہماری چشمِ گریاں کا

بلبل کی داستان سُنی گوشِ گُل نے کب ∴ انسان ہی کو لطف ہے گفت و شنید کا

دستِ ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا ∴ سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

یاں بھی مشتاق کی قسمت میں کوئی جلوہ ہے ∴ یا فقط حشر ہی پر وعدۂ دیدار رہا

خزاں ہی خوب تھی بہرِ نشیمن ∴ چمن میں ایک بھی تنکا نہ پایا

روزِ دیدار خدا خیر کرے ∴ معرکہ ہے تری زیبائی کا

یہ قیدِ محبت اک آزادگی ہے ∴ مگر کوئی جانے بھی محبوس رہنا

کیا چھپے راز، الٰہی دلِ شیدائی کا ∴ عرصۂ حشر تو بازار ہے رسوائی کا

کم نہ تھی شوخیِ رفتار سے بے تابیِ شوق ∴ راہ میں پاؤں پڑا اُن کے برابر اپنا

بلا سے اضطرابِ درد ہی بن کر ٹھہر رہنا ∴ کسی صورت سے تم رہنا مرے دل میں مگر رہنا

زاہد کا عمامہ ہو کہ ہو شیخ کی دستار ∴ ان دونوں پہ طرّہ ہے مرا دامنِ تر آج

یہ سدِّ راہ ہوا کس کا پاسِ رسوائی ∴ رُکے ہوئے ہیں مرے اشک کارواں کی طرح

آخر بشر کے واسطے کچھ شغل چاہیے ∴ کیجیے گا آپ کیا ستمِ ناروا کے بعد

ہوئے ایک دیر و حرم کے مسافر ∴ کچھ اس راہ چل کر کچھ اُس راہ چل کر

قصدِ صحرا ہے دلِ ویراں کے ساتھ ∴ اک بیاباں لے چلے ہیں گھر سے ہم

دیکھیں تو پہلے کون مٹے اس کی راہ میں ∴ بیٹھے ہیں شرط باندھ کے ہر نقشِ پا سے ہم

لاگ ہو یا لگاؤ ہو کچھ بھی نہ ہو تو کچھ نہیں ∴ بن کے فرشتہ آدمی بزمِ جہاں میں آئے کیوں

کرتے ہیں قتل وہ طلبِ مغفرت کے بعد ∴ جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

میں صبر دے بھی لوں گا دلِ بے قرار کو ∴ ٹھہرے جو ایک پل وہ تمہاری نظر نہیں

تیرے ہاتھوں مجھے اے رنجِ فراق ∴ کبھی مرنے کی بھی فرصت ہو گی
جب تم نہ ملے تو دردِ دل نے ∴ اٹھ اٹھ کے اجل کی جستجو کی
اے قیس! اگر صبا نے اڑایا تو لطف کیا ∴ اٹھا نہ پردہ صاحبِ محمل کے ہاتھ سے
کچھ تازگی ہو لذتِ آزار کے لیے ∴ ہر دم مجھے تلاش نئے آسماں کی ہے
روز جا کر اس کے کوچے سے پلٹ آتے ہیں ہم ∴ دیدۂ حسرت سے پہروں جانبِ در دیکھ کر
ٹھہر گئے وہ جہاں سروِ باغ تھے گویا ∴ اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے
رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں ∴ یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی
وہ چشمِ زار کا سنتے ہی ماجرا گھبرائے ∴ ابھی تو شرحِ دلِ بے قرار باقی ہے
دل کو تھاموں کہ تری بزم میں آنسو پوچھوں ∴ ہاتھ جب دل سے اٹھے دیدۂ تر تک پہنچے
کس طرح لے کا بلائیں کوئی آسودۂ خاک ∴ کچھ نہ پہنچے ترے گیسو جو کمر تک پہنچے
اس کی کافر نگہ کے اٹھتے ہی ∴ شورِ دیر و حرم سے اٹھتا ہے
گر پڑا ہوں نگہِ مست سے چکر کھا کر ∴ ساقیا پہلے اٹھا تو مجھے پیمانے سے
نہیں معلوم کہ ہے منزلِ مقصود کہاں ∴ عرش تک کی تو خبر آہِ رسا لائی ہے
شبِ فرقت کے جاگنے والے ∴ ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی
کون غم خوار الٰہی شبِ غم ہوتا ہے ∴ اب تو پہلو میں مرے درد بھی کم ہوتا ہے
دیکھ لی سیرِ حرم حضرتِ زاہد رخصت ∴ آپ کا کعبہ مرا بت کدہ آباد رہے
ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی ∴ عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لیے
کشتیِ نوح سے بھی کود پڑوں طوفاں میں ∴ دیں سہارا جو مجھے پار اترنے والے
شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ∴ غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری
نہیں آتا تجھے گر اے تمنا ∴ نکلنا سیکھ لے جانِ حزیں سے
اب دیکھیے مشقِ پائمالی ∴ تعریفِ خرام ہو گئی ہے

"آفتابِ داغ"

بعدِ فنا بھی اور مکدر کیا اُسے ؛ میرا غبار میرے لیے آسماں ہے اب
معرکہ ہے آج حسن و عشق کا ؛ دیکھیے وہ کیا کریں ہم کیا کریں
ہم بھی دیکھیں تو کہاں تک نہ توجہ ہوگی ؛ کوئی دن تذکرۂ اہلِ وفا ہونے دو
کہاں اے چارہ گر دل میں حرارت ؛ یہ گرمی ہے فقط ضبطِ فغاں کی
میسر ہمیں خوابِ راحت کہاں ؛ ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی
اے ناصحِ شفیق ہے کچھ تو چھیڑ چھاڑ ؛ ذکرِ حبیب کم نہیں وصلِ حبیب سے
مانندِ برق، مثلِ ہوا، صورتِ نگاہ ؛ اکثر نکل گئے ہیں وہ میرے قریب سے
انتظارِ نفسِ بازپسیں ہے ہردم ؛ سرِ منزل ہوں مگر دوری منزل ہے وہی
انتہا عشق کی خدا جانے ؛ دمِ آخر کو ابتدا کہیے
جو تیرا جذبِ دل کامل ہے اے قیس! ؛ تو پھر لیلیٰ کہاں محمل میں ہوگی
کوئی نہیں تو دل ہی سے باتیں ہیں رات بھر ؛ اللہ رے شوق حرف و حکایات کا مجھے
آنکھیں پھوٹیں جو کچھ بھی دیکھا ہو ؛ ابھی آتا ہوں دشتِ ایمن سے

"مہتابِ داغ"

یہ عقدہ عاشق و معشوق کے چلن سے کھلا ؛ سمجھ میں مسئلۂ جبر و اختیار آیا
نکہتِ گل میں ہے لپٹ اور ہی ؛ کس نے یہاں بندِ قبا وا کیا
ہمیں گلشنِ جہاں میں یہی کام آخری ہے ؛ اُسی باغباں کو واپس ثمرِ حیات کرنا

دل اس کی بزم سے کس طرح اکھڑے ؛ ٹھہر جائے جہاں عمرِ رواں تک

پڑتی ہے ضربِ محبت تو نکلتی ہے فغاں ؛ شورِ محشر سے ہم آہنگ ہے نقارۂ دل

چوٹ کھانا دلِ حزیں نہ کہیں ؛ درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں

گو مرے پاس نہیں غیرِ متاعِ کاسد ؛ میں تماشائیِ اندازِ خریدار تو ہوں

رہ روِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے ؛ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

کعبہ و دیر میں پتھرا گئیں دونوں آنکھیں ؛ ایسے جلوے نظر آئے ہیں کہ جی جانتا ہے

موت سے پیشتر ہی مر جاؤں ؛ اس قدر تاب انتظار کسے

مٹی کیا آبروئے عشق افسوس ؛ کہ اس ذلت میں بھی عزت کبھی تھی

مدد لے ہمت دشوار پسند ؛ کام آسان ہوا جاتا ہے

سنگِ اسود نہ ٹلا کعبے سے ؛ پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے

لذتِ سیر دگر چشمِ تمنا لے گی ؛ ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

قیامت میں قیامت کر گیا کون ؛ کہ دل تھامے صفِ محشر کھڑی ہے

دل جگر سب آبلوں سے بھر چلے ؛ مر چلے اے سوزِ فرقت مر چلے

شبِ فرقت ترے تصور سے ؛ مشورے ہوتے ہیں زمانے کے

"یادگارِ داغ"

رونے سے نہ مر جاؤں گا میں آپ نہ بیٹھیے ؛ یہ اشکِ رواں عمرِ رواں ہو نہیں سکتا

ہم تو وحشت میں چلے دیوارِ زنداں پھاند کر ؛ جس کو رہنا ہو رہے وہ منتظر میعاد کا

تجلی جلوہ گر لاکھوں حجابوں میں بھی ہوتی ہے ؛ چھپائے سے چھپے رنگِ ظہور ایسا نہیں ہوتا

مرے پاسِ وفا کی کاش تم مقدار ٹھہرا لو ؛ کہ اتنا مجھ سے ہو سکتا ہے اتنا ہو نہیں سکتا

مجھے ہو قسمتِ برگشتہ کی شکایت کیا ؛ زمانہ کون سے دن انقلاب سے چھوٹا

وہ جان لیں مری افسردگی کو اے قاصد! ؛ بجھی ہوئی کوئی شمعِ مزار لیتا جا

ٹھوکر بھی راہِ عشق میں کھانی ضرور ہے ؛ چلتا نہیں ہوں راہ کو ہموار دیکھ کر

محوِ قدِ یار ہو گئے ہم ؛ سولی پہ چڑھے تو سو گئے ہم

آمیزشِ ثواب ہے میرے گناہ میں ؛ دل بت کدے میں اور قدم خانقاہ میں

اے شوخ اگر یہی ہیں تلوّن مزاجیاں ؛ پوری تجھے تو طرزِ جفا بھی نہ آئے گی

سیر جس کی ہمیں ہے مدِّ نظر ؛ تیسرا وہ جہان اور ہی ہے

دل رہا آگے نگاہِ شوق سے ؛ اور کوسوں دل سے آگے ہم رہے

پہنچے کیا منزل پہ ایسا ناتواں ؛ جو دبا جاتا ہے گردِ راہ سے

سر کاٹ کے رکھ دوں گا رہِ دوست میں اپنا ؛ سجدہ مجھے کرنا نہیں آتا ہے جبیں سے

نسیمِ صبح دیتی ہے مبارکباد گلشن کو ؛ گلوں کے کان میں بادِ صبا کچھ اور کہتی ہے

طالبِ بخشش ابھی سے کیوں ہے دل ؛ کیا گنہ کرنے سے فرصت ہو گئی

مرحلے طے عشق کے اکثر ہوئے ؛ منزلِ دشوار باقی رہ گئی

اس لیے وحشت میں ہم نے کر دیا ترکِ لباس ؛ ہو گا جب دامن تو ہو گا کوئی دامن گیر بھی

قدم رکھا تھا یہ کس نے کہ ہر شیخ و برہمن کو ؛ تبرّک ہو گئی اس دن سے خاکِ آستاں میری

آپڑی ہے بحث میرے قطرہ ہائے اشک سے ؛ آج بوندیں گن رہا ہوں ابرِ گوہر بار کی

دو قدم چل چل کے گرتے ہیں طریقِ عشق میں ؛ ٹھوکریں ہیں منزلیں اس راہِ ناہموار کی

جانے وہ اہلِ کعبہ کہ ہے اس میں مصلحت ؛ جاتا ہوں بت کدے کو بڑے کام کے لیے

وہ کوہِ طور تھا موسیٰ کا حصّہ ؛ الٰہی میں تجھے دیکھوں کہاں سے

شمارِ کثرتِ عصیاں کا ہو نہیں سکتا ؛ کسے خبر ہے کہ اندازۂ کرم کیا ہے

عمرِ دراز خضر کو کیوں ہو گئی عطا ؛ یہ تو مجھے کسی کی محبت میں چاہیے

صبحِ شبِ وصال نہ تھا کوئی میرے پاس ؛ اک شمع ساری رات کی وہ بھی جلی ہوئی
عاشق کو بھی واعظ تو بنا تا ہے نمازی ؛ دیوانے سے پابندیِ اوقات نہ ہوگی

اب تفنّنِ طبع کے لیے غالبؔ کے بھی ۵۰ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو اگرچہ اُنھی کے فکر کردہ ہیں تاہم اُن کے مخصوص رنگ میں نہیں بلکہ داغؔ کے رنگ میں ہیں۔ یہ اشعار دیوانِ غالبؔ (متداول) سے لیے گئے ہیں جو خود غالبؔ کے انتخاب کردہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی شوخ طبیعت کو ایسے اشعار بصد شوق گوارا تھے۔

چونکہ غالبؔ کے کلام میں اس رنگ کے اشعار خال خال ہی ہیں اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ داغؔ کے مخصوص رنگ کی ایجاد میں غالبؔ کے ان اشعار کا عمل دخل بھی رہا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے غالبؔ برنگِ داغؔ ؎

غالبؔ برنگِ داغؔ

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ مگر ؛ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ؛ ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ؛ رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ؛ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ؛ بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے ؛ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب ؛ قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ؛ تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ؛ اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ؛ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی ؛ عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے ؛ نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ ؛ بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے ؛ یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل ؛ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے ؛ چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں ÷ پھر وہی زندگی ہماری ہے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو ÷ نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے ÷ پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا ÷ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں ÷ کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا ÷ ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

لو، ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں ÷ اچّھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے ÷ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو ÷ رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں ÷ دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ÷ سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ÷ ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ٭ ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے ٭ کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ ٭ اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ٭ لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ٭ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم! ٭ میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر ٭ کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد ٭ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ٭ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا ٭ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ ٭ جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھا ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ٭ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خو بُری نہیں ٭ بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ٭ چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے ؛ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو ؛ کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں ؛ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ؛ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ؛ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ؛ اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے ؛ رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے ؛ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

توقیتِ داغ

۱۷۵۲ء کے لگ بھگ	قاسم جان، عالم جان اور عارف جان ۔ تین بھائی، احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) کے عہد میں ہندوستان آئے اور اٹک میں حکومتِ دہلی کی طرف سے مرزا محمد بیگ صوبیدار اٹک کے یہاں عارضی طور پر ٹھہرے قاسم جان اور عالم جان جلد ہی آگے دہلی کی طرف روانہ ہو گئے مگر عارف جان کئی برس مرزا محمد بیگ کے یہیں رہ کر کام میں اُن کی مدد کرتے رہے
۱۷۶۰ء کے لگ بھگ	مرزا محمد بیگ کی بیٹی سے عارف جان کی شادی
۱۷۶۲ء کے لگ بھگ	عارف جان کا پہلا بیٹا نبی بخش خاں پیدا ہوا

۱۷۶۵ء کے لگ بھگ	عارف جان کا دوسرا بیٹا احمد بخش خاں پیدا ہوا
۱۷۶۶ء (شروعِ سال؟)	عارف جان، شاہ عالم (۱۷۵۹ء - ۱۸۰۶ء) کی طلبی پر دہلی (مع عیال و اطفال) چلے آئے (قیاس ہے کہ احمد بخش خان بیس برس کی عمر تک یعنی مولانا فخرالدّین چشتی کی وفات تک دہلی ہی میں رہے)
۱۷۶۶ء (آخرِ سال؟)	دہلی میں الٰہی بخش خاں (بعد میں خُسرِ غالب) عارف جان کا تیسرا بیٹا پیدا ہوا
۱۷۸۵ء ۲۰ نومبر	مولانا فخرالدّین چشتی کی وفات۔ احمد بخش خاں اُن سے بیعت تھے۔ ایک دن جب احمد بخش خاں انہیں وضو کرا رہے تھے تو مولانا صاحب نے احمد بخش خاں کو والیِ میوات کہہ کر پکارا، جو بالآخر سچ ثابت ہوا
۱۷۸۶ء تا ۱۷۹۹ء (ستمبر؟)	اس بارہ تیرہ سال کے عرصے میں احمد بخش خاں پہلے گوالیار میں بزمرۂ سواراں ملازم ہوئے۔ بعد میں (اگست ۱۷۹۹ء کے بعد) اجمیر سے دہلی آتے ہوئے راجا بختاور سنگھ والیِ الور سے ملاقات ہوگئی اور وہ ان کی ملازمت میں الور چلے گئے
۱۸۰۲ء کے لگ بھگ	احمد بخش خاں کی بہن کی غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں سے شادی

۱۸۰۳ء یکم نومبر — لسواڑی کی لڑائی میں احمد بخش خاں کے ایما پر الور کا فوجی دستہ بھی انگریزوں کی مدد کے لیئے شامل۔ احمد بخش خاں بہت بہادری سے لڑے اور ایک انگریز سالار کی جان بچائی۔ انگریزوں کی فتح

۱۸۰۴ء ۲۲ دسمبر — جب فتح کا دربار منعقد ہوا تو لارڈ لیک نے راجا بختاور سنگھ کو بہ اعمال جاگیر میں عطا کیے۔ احمد بخش خاں کا نام سند میں، فخر الدولہ، دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر، رستم جنگ لکھوایا اور جاگیر کے طور پر فیروزپور جھرکا، پونا ہانا، بچھور، سانکرس، نگینہ وغیرہ انتفاع عنایت فرمائے پرگنہ لوہارو راجا بختاور سنگھ نے اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس طرح سے احمد بخش خاں، نواب احمد بخش خاں والیِ فیروزپور جھرکا و لوہارو ہو گئے

۱۸۰۷ء کے لگ بھگ — ایک مغنیہ عورت مدّی سے تعلق
گیا تا شمس آباد ضلع گوڑ گانواں کے سندارام نامی میو کی دو بیٹیاں تھیں ایک کا نام موتی تھا اور دوسری کا مدّی۔ موتی راجا بختاور سنگھ نے اپنے ہاں رکھ لی اور مدّی نواب احمد بخش خاں نے

۱۸۰۹ء — احمد بخش خاں کے بیٹے شمس الدین احمد خاں کی ولادت مدّی کے بطن سے

۱۸۱۲ء کے لگ بھگ — احمد بخش خاں کی برلاس مغل نیاز محمد بیگ کی بیٹی بیگم جان سے شادی
(بیگم جان کا انتقال ۴ر نومبر ۱۸۶۶ء کو ہوا)

۱۸۱۳ء کے لگ بھگ — وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم والدۂ داغ کی ولادت ۔ یہ محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی تین بیٹیوں میں سب سے چھوٹی تھیں اور بہت حسین تھیں

۱۸۱۴ء — احمد بخش خاں کے بیٹے امین الدین احمد خاں کی ولادت بیگم جان کے بطن سے (تقریباً اسی زمانے میں بہو بیگم کے لقب کے ساتھ احمد بخش خاں نے مُدّی کو باقاعدہ بیوی تسلیم کرلیا۔ اس طرح شمس الدین احمد خاں کو بھی جانشینی کا حق ہو گیا)

۱۸۱۵ء ۲۰ جنوری — مہاراؤ راجا بختاور سنگھ کی وفات ۔ مُدّی کی بہن (شمس الدین احمد خاں کی خالہ) موسی ، راجا کے ساتھ ستی ہو گئی

۱۸۲۱ء اکتوبر — احمد بخش خاں کی دوسری بیوی بیگم جان کے بطن سے دوسرے بیٹے ضیاء الدین احمد خاں کی ولادت

۱۸۲۷ء اکتوبر — احمد بخش خاں کا انتقال

۱۸۳۰ء تقریباً — وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم نواب شمس الدین احمد خاں سے متعلق

۱۸۳۱ء ۲۵ مئی — داغ بدھ کے دن تقریباً دو بجے پیدا ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصلی نام ابراہیم تھا۔ شادی کے بعد احباب انہیں نواب مرزا کہنے لگے۔ چاندنی چوک ... کے جس مکان میں داغ کا جنم ہوا تھا وہ ان کے والد نواب شمس الدین احمد خاں ہی نے چھوٹی بیگم کو دلا رکھا تھا جو عرصے تک ان کی تحویل میں رہا

۱۸۳۵ء ۲۲ مارچ — ولیم فریزر (دہلی میں گورنر جنرل کے ایجنٹ) کا قتل

۱۸۳۵ء ۲۶ اگست — اس قتل کے جرم میں کریم خاں (شمس الدین احمد خاں کے نوکر) کو پھانسی

۱۸۳۵ء ۸ اکتوبر — نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی، جو اپنے والد احمد بخش خاں کی زندگی ہی میں والی فیروز پور جھرکا قرار دے دیئے گئے تھے، قتل فریزر کے جرم میں پھانسی۔ داغ کی عمر اس وقت چار سال ساڑھے چار مہینے کی تھی

[عین ممکن ہے کہ جس طرح احمد بخش خاں نے شمس الدین احمد خاں کی والدہ مُدّی کو بعد میں منکوحہ بیوی بنا کر بہو بیگم یا بہو خانم نام دے دیا تھا تاکہ شمس الدین احمد خاں بھی قانونًا

اُن کے وارث بن سکیں، اسی طرح شمس الدّین احمد خاں بھی چھوٹی بیگم سے باقاعدہ نکاح کر لینے کی سوچ رہے ہوں مگر موت نے مہلت نہ دی۔ اس طرح چھوٹی بیگم اور داؔغ دونوں نے شمس الدّین احمد خاں کی ضبط شدہ ریاست اور املاک کے خلاف بطور وارث چارہ جوئی کرنے کی جرأت نہ کی ــــــــــــــــــــــــ]

۱۸۳۶ء تا ۱۸۳۹ء (؟)	چھوٹی بیگم والدۂ داؔغ ایک انگریز مارسٹن بلاک سے وابستہ (ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی بادشاہ بیگم خفی پیدا ہوئے) [شمس الدّین احمد خاں کی وفات (۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء) کے بعد داؔغ کی پرورش تین چار سال تک ان کی خالہ عمدہ خانم دہلی میں کرتی رہیں۔ جب ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور ہوئے تو یوسف علی خاں بھی عمدہ خانم اور داؔغ کے ساتھ رام پور چلے گئے۔ وہاں داؔغ نے مولوی غیاث الدین (مؤلف غیاث اللغات) سے تعلیم حاصل کی اور نواب یوسف علی خاں سے سکندر نامہ پڑھا ـــ]
۱۸۳۷ء ۲۸ ستمبر	شام کے چھ بجے اکبر شاہ ثانی، شاہِ دہلی کا انتقال
۱۸۳۷ء ۲۹ ستمبر	علی الصباح تین بجے شہزادہ ابوظفر، سراج الدین محمد بہادر شاہ غازی کے خطاب کے ساتھ تخت نشین

۱۸۳۷ء ۲۰ نومبر	راج دربار سے فارسی زبان کے اخراج کا حکم
۱۸۳۸ء ۲۳ نومبر	شاہ نصیر کا انتقال
۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۲ء (؟)	چھوٹی بیگم اب آغا تراب علی سے متعلق (۱۸۴۱ء۔ آغا مرزا شاغل تولد ہوئے)
۱۸۴۳ء	چھوٹی بیگم کچھ عرصے ضیاء الدّین احمد خاں نیّر درخشاں کے پاس بھی رہیں
۱۸۴۴ء	چھوٹی بیگم، مرزا فخرو، ولی عہد شاہ دہلی سے وابستہ ہوکر لال قلعہ میں (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باقاعدہ نکاح ہوا تھا اور شوکت محل خطاب پایا تھا)
۱۸۴۵ء	چھوٹی بیگم کے قلعے میں پہنچنے کے بعد داغ کو بھی وہیں بلوا لیا گیا داغ کے قلعے میں آکر باقاعدہ تعلیم کے لیے مولوی احمد حسین ولد میر غلام حسین المتخلص بہ شکیبا سے (جو میر تقی میر کے شاگرد تھے) درسی کتابیں پڑھیں اور خوش خطی و خوش نویسی سیّد محمد میر پنجہ کش دہلوی سے سیکھی اور قلعے ہی میں فنون سپہ گری مثلاً شہ سواری، بانک، تلوار چلانا، نشانہ بازی وغیرہ فنون میں تعلیم پائی

۱۸۴۵ء — مرزا خورشید عالم کی ولادت (خورشید عالم ۱۲۶۱ھ)

۱۸۴۵ء — داغ کی ذہانت اور طبع کو دیکھ کر صاحبِ عالم ولی عہد بہادر نے ذوق کا شاگرد کرا دیا

۱۸۴۵ء — پہلے پہل مشاعرے میں شرکت نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے یہاں۔ داغ کی غزل کا مطلع تھا ؎

شرر و برق نہیں شعلہ و سیماب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بے تاب نہیں

۱۸۴۵ء — زینت باڑی کے مشاعرے میں شمولیت۔ امام بخش صہبائی نے اس شعر پر اٹھ کر گلے سے لگا لیا ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

۱۸۴۶ء — مرزا داغ کی شادی خالہ زاد بہن فاطمہ بیگم کے ساتھ

۱۸۵۲ء ۱۴ مئی — مومن کی وفات

۱۸۵۳ء ۳ جون (؟) — لال قلعے کا مشاعرہ۔ اس شعر پر بادشاہ ظفر نے داغ کو اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

۱۸۵۴ء ۱۶ نومبر — ذوق استادِ داغ کی وفات

۱۸۵۶ء ۱۰ جولائی	مرزا فخرو ولی عہد سلطنت کی بعارضۂ ہیضہ یا زہر خوانی ۲۸ سال کی عمر میں وفات۔ والدۂ داغ چھوٹی بیگم پھر سے بے شوہر کی ہو گئیں اور داغ پھر سے بے باپ کے
۱۸۵۷ء مئی	ہنگامہ شروع۔ پہلا دیوان تلف (کچھ غزلیں بعد میں حافظے کی مدد سے گلزارِ داغ میں شامل کر لی گئی تھیں)
۱۸۵۷ء آخر	والیٔ رام پور نواب یوسف علی خاں کے دامنِ عاطفت میں۔ داغ کو نواب رام پور نے اپنے عہد میں ہمیشہ بطورِ مہمان رکھا
۱۸۶۵ء ۲۱ اپریل	نواب یوسف علی خاں کا انتقال۔ نواب کلب علی خاں مسند نشین [۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۶ء تک وہ بطورِ مہمان ہی رہے لیکن اسی دوران میں اُن کا دہلی آنا جانا رہا۔ بلکہ کئی بار دہلی کی سکونت کافی لمبی بھی ہوتی رہی]
۱۸۶۶ء ۱۱ اپریل	۷۰ روپئے ماہوار پر باقاعدہ تقرر۔ معتمدِ خاص کارخانہ جات واصطبل گاڑی خانہ و شتر خانہ
۱۸۶۶ء قیاساً آخر	ایک روز داغ جب صبح کے وقت اصطبل پہنچے تو در اُنے پر ایک کاغذ چپاں دیکھا جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا: شہرِ دہلی سے آیا اک مشکی ؛ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

کہتے ہیں کہ شعر احمد علی رسا رام پوری (متوفی ۱۸۹۱ء) کا تھا اور رشک و رقابت کی وجہ سے کہا گیا تھا

۱۸۶۶ء دسمبر	نواب رام پور کے ساتھ کلکتہ کا سفر
۱۸۶۹ء ۱۵ فروری	غالب کا انتقال
۱۸۷۲ء	نواب رام پور کے ہمراہ حج کرنے گئے (نومبر ۱۸۷۲ء تا مارچ ۱۸۷۳ء)
۱۸۷۸ء	پہلے دیوان گلزارِ داغ کی اشاعت
۱۸۷۹ء	منی بائی حجاب کی بے نظیر باغ کے میلے میں شرکت۔ داغ اس کے حلقۂ زلف کے اسیر
۱۸۷۹ء	چھوٹی بیگم والدۂ داغ کا انتقال
۱۸۸۲ء	[حجاب، داغ کے بلانے پر صرف ایک بار اور بے نظیر باغ کے میلے میں آئیں، ورنہ وہ داغ کو کلکتہ ہی بلاتی رہیں ــ ا اپریل میں بالآخر کلکتہ کے لیے روانہ اور وہاں سے ۳ جولائی کو واپس ہوئے اور ۶ جولائی کو رام پور پہنچ گئے [کلکتہ جاتے ہوئے پٹنہ میں اور پھر کلکتہ میں کئی مشاعرے ہوئے اور داغ کی بڑی شہرت ہوئی]
۱۸۸۲ء	مثنوی فریادِ داغ چھپی

۱۸۸۵ء — دوسرے دیوان آفتابِ داغ کی اشاعت

۱۸۸۷ء ۲۳ مارچ — نواب کلب علی خاں کا انتقال، انتظامِ ریاست اعظم الدین خاں کے ہاتھ میں

۱۸۸۷ء ۲۸ دسمبر — دربارِ رام پور سے مستعفی

۱۸۸۸ء جنوری تا مارچ — مسلسل سفر میں رہے۔ امرتسر، کشن کوٹ، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ متھرا، جے پور وغیرہ

۱۸۸۸ء ۷ اپریل — کو حیدرآباد پہنچے اور بازار شیدی (سعدی) عنبر میں قیام کیا۔ "داغ کا مکان اس سے متصل اور سیف الحق دہلوی ادیب، مترجم اخبارات سرکاری سے قریب تھا۔ داغ، سیف الحق کے مہمان ہوئے۔"

۱۸۸۹ء ۱۲ جولائی — کو حیدرآباد سے نکلے۔ بنگلور، بمبئی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے دہلی واپس

(حیدرآباد کے اس سوا سالہ قیام میں داغ نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر نظام تک رسائی ہونے کی کوئی صورت نہ نکلی۔ اخراجات بہت تھے، لہٰذا دہلی واپس آنا پڑا۔ وہاں آکر بھی کوشش جاری رہی۔ آخر ساڑھے آٹھ ماہ دہلی میں رہ کر .... ل

۱۸۹۰ء ۲۹ مارچ — کو پھر حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے

٦ " اس مرتبہ حیدرآباد کے محلے محبوب گنج میں کمان کے قریب واقع ایک مکان میں رہائش اختیار کی۔ یہ مکان مولوی ظہور علی وکیل کے گھر کے قریب واقع تھا جب داغ نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ . . . . چند برسوں کے بعد داغ محلہ محبوب گنج کی سکونت ترک کر کے ٹرپ بازار کی ایک کشادہ اور شاندار کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے"۔ . . ما

۱۸۹۱ء ۶ فروری — کو نظام، تاجدارِ دکن نے، پہلی بار اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا" اتوار کی شب ۹ بجے چوبدار ایک سر بمہر لفافے میں غزل لے کر داغ کے مکان پہنچا اور صبح دربار میں حاضری کا مژدۂ جانفزا بھی سنایا" (داغ کے مکان سے مراد غالباً یہی محبوب گنج والا مکان ہوگا) لیکن ابھی تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی

۱۸۹۱ء ۴ اکتوبر — کو روزِ اوّل سے تنخواہ کا حکم صادر ہوا

۱۸۹۳ء ۸ نومبر — "خانی و بہادر ناظم یار جنگ و دبیر الدولہ فصیح الملک بلبلِ ہندوستان اور جہان استاد، کے خطابات عطا ہوئے . . . . ایک گاؤں بھی عنایت فرمایا تھا . . . . اور ایک باغ بھی . . . ."

۱۸۹۳ء	۲۳ دسمبر	تیسرے دیوان مہتاب داغ کی کتابت کی تکمیل
۱۸۹۸ء	تقریباً دسمبر	فاطمہ بیگم اہلیہ داغ کا انتقال
۱۸۹۹ء	دسمبر	نظام کے ساتھ سفرِ کلکتہ
۱۹۰۰ء	۵ ستمبر	کو امیر مینائی حیدرآباد پہنچے
۱۹۰۰ء	۱۴ اکتوبر	امیر مینائی کا انتقال
۱۹۰۲ء	آخرِ دسمبر	دہلی دربار منعقدہ یکم جنوری ۱۹۰۳ء میں شرکت کے لیے نظام دہلی آئے داغ ہمراہ تھے
۱۹۰۳ء	۱۸/۱۹ جنوری	منی بائی حجاب کا حیدرآباد میں داغ کے مکان پر خیر مقدم. (اس سے پہلے حجاب نے داغ کو آخری بار ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتے میں الوداع کہی تھی)
۱۹۰۴ء	اگست	حجاب، باہمی کشیدگی کی وجہ سے واپس کلکتے روانہ
۱۹۰۵ء	۱۶ فروری	بوقت شام انتقال ۶ نمازِ جنازہ صبح کو حیدرآباد کی تاریخی مکہ مسجد میں ادا کی گئی اور درگاہ یوسفین میں اپنی اہلیہ کی قبر کے پہلو میں دفن کیے

گئے سینکڑوں تاریخیں کہی گئیں۔ استاذی قبلہ جوش ملسیانی تلمیذ داغ نے بھی دس شعر کا قطعۂ تاریخِ وفات کہا تھا جس کا آخری شعر یہ ہے ؎

محفلِ غم میں سنا دو جوش یہ سالِ رحیل
بلبلِ ہندوستان آج اپنے گلشن میں نہیں

۱۳۲۲ھ

۱۹۰۵ء نومبر — چوتھے دیوان یادگارِ داغ کی طباعت
(اس سے پہلے ایک دیوان خوشخط لکھا ہوا چوری ہو گیا تھا جس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ داغ کے انتقال کے بعد ایک اور دیوان' کچھ جھگڑا کھڑا ہونے کی وجہ سے 'نظام نے تحویل میں لے لیا تھا جو آج تک وہیں کہیں ہے)

۱۲-۱۹۱۱ء — پانچویں دیوان ضمیمہ یادگارِ داغ کی اشاعت
(کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ایک لے پالک بیٹا احمد مرزا (جو داغ کے علاتی بھائی امیر مرزا کا فرزند تھا) صغر سنی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی سالی کی نواسی لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا، جس کی دوسری شادی داغ نے نواب سراج الدین احمد خاں سائل سے کر دی تھی ....)

۱۹۹۳ء ۲۵ دسمبر — لاڈلی بیگم کا انتقال لاہور میں بعمر ۹۳ سال

اِنتخابِ غزلیاتِ داغؔ

اُردو غزل اور داغؔ گویا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ کا مقام اردو غزل میں بھلے ہی نہایت ارفع و اعلیٰ ہو مگر جہاں کہیں غزل کا ذکر چھڑتا ہے، ذہن پہلے داغؔ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ داغؔ کی غزل رائج الوقت حُزنیہ لب و لہجہ کا مُنہ توڑ جواب تھا۔ اسی لیے دیکھتے ہی دیکھتے بڑے شہروں سے چھوٹے قصبوں تک داغؔ ہی کے طرزِ سخن کا بول بالا نظر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نشاطیہ رنگِ سخن کے انتظار میں تھا۔ اس پر روزمرّہ، محاورہ، ضرب الامثال، شوخی، طنز و تمسخر، معاملہ بندی، محبوب سے چھیڑ چھاڑ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور غزل کان میں پڑتے ہی رس گھولنے لگی۔ بالآخر میرؔ اور غالبؔ کے بعد، داغؔ ہی دہلی اسکول کے آخری صاحبِ طرز شاعر کہلائے۔

داغؔ کی شاعری میں کوئی فلسفیانہ گہرائی نہیں ہے اور یہی خرابی لکھنوی شاعری کی خارجیت میں بھی ہے مگر جہاں داغؔ کا قد روایتی خارجی شاعروں سے بانسوں اوپر اُٹھ جاتا ہے وہ اُن کے مزاج اور اُن کی شاعری کی یک رنگی ہے۔ انھوں نے دوسرے

شاعروں کے برعکس اپنی شخصیت کو اپنی شاعری سے الگ نہیں کیا۔ وہ جو کچھ تھے وہی اُن کے اشعار سے ظاہر ہے۔ وہ جیسا عملی زندگی میں سوچتے تھے اُسی سوچ کو اپنے شعروں میں ڈھال دیتے تھے اور جس خوبی سے ڈھالتے تھے اُس کا تو کیا ہی کہنا ہے

باتیں سنیئے تو پھڑک جایئے گا
گرم ہیں داغ کے اشعار بہت

داغ کی ایک ہزار سے زائد غزلوں کے ذریعے تقریباً پندرہ ہزار اشعار چھپ کر ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سے محض ۸۶۵ اشعار انتخاب کرنا کارے دارد۔ اس لیے میں نے آنکھ موند کر ۳۰۱ غزلیں داغ کے پانچ دیوانوں سے نکال لیں اور اُن میں سے اشعار اس طرح اخذ کیے کہ

(۱) ہر غزل کا مطلع اور مقطع انتخاب کر لیا تاکہ منتخب ہو کر بھی غزل غزل ہی لگے اور
(۲) اختصار کے پیشِ نظر کسی غزل سے مطلع اور مقطع کے علاوہ تین اشعار سے زیادہ منتخب نہیں کیے۔

اس عمل سے یہ نقصان ضرور ہوا ہے کہ اکثر مقطعے منتخب اشعار کے بجائے بھرتی کے اشعار بن کر رہ گئے ہیں مگر ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ تاہم اشعار تو داغ ہی کے فکر کردہ ہیں۔ پڑھیے اور لطف اُٹھایئے۔

گلزارِ داغ

(۱۸۷۸ء)

صبر لے زاہدِ نافہم نہ مے خواروں کا
بخشنے والا بھی دیکھا ہے گنہگاروں کا

ڈر گئے نامِ شفا سن کے ترے خواہش مرگ
منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

دو قفس ہم اپنے جو صیاد نے زلفیں چھوڑیں
اور جی چھوٹ گیا آج گرفتاروں کا

اشکِ خوں آنکھ سے جلتے ہوئے اتنے ٹپکے
کہ جہاں میں ہوں وہاں فرش ہے انگاروں کا

صبرِ ایوب کی اے داغ نہ کرنا خواہش
کہ محبت میں تو یہ کام ہے بے کاروں کا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ الفت کبھی نہ کرنا
تمہیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

لیے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

وہ ہے ہمارا طریقِ الفت کہ دشمنوں سے بھی مل کے چلنا
یہ ایک شیوہ ترا ستمگر کہ دوست سے دوستی نہ کرنا

بیانِ دردِ فراق کیسا کہ ہے وہاں اپنی یہ حقیقت
جو بات کرنی تو نالہ کرنا نہیں تو وہ بھی کبھی نہ کرنا
بُری ہے اے داغ راہِ اُلفت خدا نہ لے جائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

طُورِ کیوں خاک ہوا نور ترا نار نہ تھا
ناز تھا حضرتِ موسیٰ سے، وہ دیدار نہ تھا
ذکرِ مجنوں سے مجھے آگ لگی جاتی ہے
گرچہ ظاہر میں تمہارا وہ طلب گار نہ تھا
شب کو کیوں کر خلشِ دل نہ دکھاتی لذت
تیرا ارمان تھا پیکان نہ تھا خار نہ تھا
سحر تھی چشمِ فسوں ساز کہ ملتے ہی نظر
میں نے پہلو میں جو دیکھا تو دلِ زار نہ تھا
دل کا سودا اور اس اغماض سے اور ایسی جگہ
داغ وہ انجمنِ ناز تھی بازار نہ تھا

نہ کبھی جیبِ خجالت سے یہاں سر نکلا
قیس دیوانہ تھا جامے سے جو باہر نکلا
عشق نے خوب کیا ظاہر و باطن یکساں
داغ جو سینے پہ دیکھا وہی دل پہ نکلا
ہم تو بے نام و نشاں آپ کی الفت میں ہوئے
آپ کا نام نکلنا تھا ستمگر! نکلا
جذبِ دل کا ہو بُرا کھینچ بلایا اُس کو
جو نہ در تک کبھی آیا تھا وہ باہر نکلا
آفریں داغ تجھے خوب نباہی تو نے
مرحبا کوچۂ دلدار سے مر کر نکلا

جب یقین عشق آیا پھر وہ بُت کہاں اپنا
آ گئے غضب میں ہم دے کے امتحاں اپنا
بچ رہے گا کوئی تو برق و باد و باراں سے
ہر درخت پہ باندھا ہم نے آشیاں اپنا
ہائے میرے قاتل کو مفت کی ہے بدنامی
کام کر گئی ہوتی مرگِ ناگہاں اپنا

ہم ستم رسیدوں کو زندگی مصیبت ہے — خضر پر دھرے احساں عمرِ جاوداں اپنا

دھوم صبحِ محشر کی داغ سنتے آتے ہیں
پر نہیں کچھ اندیشہ خواب ہے گراں اپنا

راہ بر بن کر رہِ الفت میں رہزن بن گیا — دل نے کی یہ دوستی ہم سے کہ دشمن بن گیا
رہروانِ معرفت کا داں سیا جاتا ہے منہ — جادۂ راہِ حقیقت تارِ سوزن بن گیا
کشتِ دل میں دیکھ تخمِ عشق کی بالیدگی — ہم تو قائل اُس کے ہیں جو دانہ خرمن بن گیا
گل کھلاتا ہے خزاں میں بھی مرادستِ جنوں — جب چھلے زخمِ کہن اک تازہ گلشن بن گیا

مستِ مے کل تک تو مے خانے میں تھا اور آج داغ
داغِ مے دامن سے دھو کر پاک دامن بن گیا

جب تک کسی کی چاہ نہ تھی کیا سرور تھا — میرا ہی دل بغل میں مری رشکِ حور تھا
یاں امتحانِ برقِ تجلی ضرور تھا — کیا میں نہ تھا اس آگ میں جلنے کو طور تھا
پاسِ ادب سے رہ گئی فریاد کچھ ادھر — میں کیا کہوں کہ عرشِ بریں کتنی دور تھا
کرنی پڑیں فراق میں تیمارداریاں — ہاتھوں میں ساری رات دلِ ناصبور تھا

اے داغ صدمۂ غمِ ہجراں بجا درست
یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا

اُس بت کو جب خیالِ ستم ہو کے رہ گیا — میں مضطرب خدا کی قسم ہو کے رہ گیا
واعظ سے ہم سے بحث رہی کوئے یار میں — ذکرِ بہشت و خلد و ارم ہو کے رہ گیا
پورا ہوا نہ ایک بھی دل کا مسودہ — فرسودہ لاکھ بار قلم ہو کے رہ گیا
دل نے تری گلی سے نہ اٹھنے دیا مجھے — سو بار قصدِ دیر و حرم ہو کے رہ گیا

اے داغ ہم نہ دیکھ سکے روزِ حشر کچھ
سر خجلتِ گناہ سے خم ہو کے رہ گیا

اُس بزم میں شریک بھی جایا نہ جائے گا
مَیں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقین
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح
یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

فتنہ نہیں ہوا جس کو اُٹھایا کرے فلک
مجھ سے گرے ہوئے کو اُٹھایا نہ جائے گا

اے داغ تجھ کو رزق کی خواہش ہے چرخ سے
اتنا یہ غم کھلائے گا کھایا نہ جائے گا

جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا

لگا کر تیغ قصہ پاک کیجے دادخواہوں کا
کسی کا فیصلہ گر منصفی سے ہو نہیں سکتا

مرا دشمن بظاہر چار دن کا دوست ہے تیرا
کسی کا ہو رہے یہ ہر کسی سے ہو نہیں سکتا

نہ رونا ہے طریقے کا نہ ہنسنا ہے سلیقے کا
پریشانی میں کوئی کام جی سے ہو نہیں سکتا

خدا جب دوست ہے اے داغ کیا دشمن سے اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دشمنی سے ہو نہیں سکتا

ہے مجھ کو خبر رات کو جو تیرے قریں تھا
مَیں گرچہ نہ تھا پاس مگر دل تو وہیں تھا

سب خاک ہوئیں آج میرے دل کی امیدیں — کل تک تو تری ذات سے کیا کیا نہ یقیں تھا
اب دل میں ہوا تیری جگہ درد کا مسکن — یہ وہ ہی مکاں ہے کبھی تو جس میں مکیں تھا
روپوش ہوا سنتے ہی پیغام ہمارا — ڈھونڈھے کوئی قاصد کو ابھی تک تو یہیں تھا
دل میں نہ رکھے آدمی اتنی بھی کدورت
انسان ہی تھا داغ بھی گو خاک نشیں تھا

جہاں میں کیا نہ ڈھونڈھا کیا نہ پایا — مزاج اُن کا دماغ اُن کا نہ پایا
تری جانب ہی پھر جاتی خدائی — مگر کافر تجھے اتنا نہ پایا
خوشی ملتی تو کیا ملتی ازل میں — غنیمت ہے کہ غم تھوڑا نہ پایا
گہر کی آبرو ہے جوہری سے — بڑا پایا تو مول اچھا نہ پایا
سفارش ہم تری کرتے برائے داغ
کچھ اُن کا تجھ سے رُخ اچھا نہ پایا

کوئی آگے نکل نہیں سکتا — تجھ سے فتنہ بھی چل نہیں سکتا
زورِ قسمت سے چل نہیں سکتا — دل سنبھالے سنبھل نہیں سکتا
آسماں دوست ہو گیا تیرا — اب زمانہ بدل نہیں سکتا
ہم تو اُس مدّعا کے قائل ہیں — جو زباں سے نکل نہیں سکتا
نام کو داغ ہوں مگر ظالم
تو جلائے تو جل نہیں سکتا

یہ قول کسی کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — وہ کچھ نہیں کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اُن کا یہی سننا ہے کہ وہ کچھ نہیں سنتے — میرا یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

خط میں مجھے اوّل تو سنائی ہیں ہزاروں — آخر میں یہ لکھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تم کو یہی شایاں ہے کہ تم دیتے ہو دشنام — مجھ کو یہی زیبا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مشتاق بہت ہیں مرے کہنے کے پرائے داغ
یہ وقت ہی ایسا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

عیش بھی اندوہ فزا ہو گیا — ہائے طبیعت تجھے کیا ہو گیا
داغ وہ بہتر ہے جو مرہم بنا — درد وہ اچھا جو دوا ہو گیا
آپ سے اقرار کے سچے کہاں — وعدہ کیا اور وفا ہو گیا
سامنے میرے جو چُراتے ہو آنکھ — آئنہ کیا آج نیا ہو گیا

داغ قیامت میں یہ مژدہ سنے
جا تجھے فردوس عطا ہو گیا

کچھ سعی سے اقبال میسّر نہیں ہوتا — ہر آئنہ گر داغ! سکندر نہیں ہوتا
کیا کوئی زمانے میں ستمگر نہیں ہوتا — ہوتا ہے مگر تیرے برابر نہیں ہوتا
بیداد تری دیکھ کے یہ حال ہوا ہے — عاشق کوئی دنیا میں کسی پر نہیں ہوتا
تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے — عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

اے داغ نہ دے جان محبت میں کہ نادان
پھر زندہ جہاں میں کوئی مر کر نہیں ہوتا

کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا — ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا
جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا — تمھیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا
یہ مزا ہے دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی — نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

تمہے وعدے پر ستم گر ابھی اور صبر کرتے   اگر اپنی زندگی کا ہمیں اعتبار ہوتا

تمہیں ناز ہو نہ کیونکر کہ لیا ہے داغؔ کا دل
یہ رقم نہ ہاتھ لگتی نہ یہ افتخار ہوتا

وہ رات کون سی گزری جو اضطراب نہ تھا   جب آنکھ دی تھی خدا نے مجھے تو خواب نہ تھا
وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چار طرف   ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا
ہزاروں پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں   اُسے حجاب تھا موسیٰ کو تو حجاب نہ تھا
اگرچہ بادہ کشی تھی گناہ اے زاہد   جو تجھ سے چھین کے پیتا تو کچھ عذاب نہ تھا

بغیر داغؔ کے جنّت تمہاری بزم رہی
ہزار شکر کہ وہ خانماں خراب نہ تھا

وہ جاتے ہیں آتی ہے قیامت کی سحر آج   روتا ہے گلے مل کے دعاؤں سے اثر آج
اُمیّد یہ کہتی ہے وہ آتے ہیں ٹھہر جا   ہے یاس کی تاکید کہ دنیا سے گزر آج
جس دوست کو دیکھا مجھے دشمن نظر آیا   جب تک مری نظروں میں رہی تیری نظر آج
بسمل ہی کیا اُس کو جسے خواب میں دیکھا   سوتے میں بھی لڑتی رہی قاتل کی نظر آج

تھی کل سے تلاش اُن کی مرے قتل برائے داغؔ
نکلے وہ عزادار نے غیر کے گھر آج

کیوں کر دکھاؤں حالِ دل اُس کو بٹھا کر دل کے پاس
نخوت سے جو بائیں طرف بیٹھے نہ اس مائل کے پاس

رہبر نے راہِ عشق میں برسوں دیے چکر مجھے
ظالم سے جب پوچھا کہا تم آ گئے منزل کے پاس"

بحرِ محبت جوش پر میں کیا کروں نو مشق ہوں
دم ٹوٹ جاتا ہے مرا آتا ہوں جب ساحل کے پاس

ہاں اے ہوس ہمت کہ ہے دستِ ادب دامن سے دور
ہاں اے تپش جرأت کہ ہوں اک جست میں قاتل کے پاس

دیکھے ہیں حسن و عشق کے ہم نے نرالے شعبدے
موسیٰ کی جو مٹھی میں تھا وہ داغ نکلا دل کے پاس

آئے وہ بے وفا یہاں اُس کی بلا کو کیا غرض
جائے درِ قبول تک میری دعا کو کیا غرض

موت کو اے دلِ حزیں اور بہانے ہیں بہت
آئے جو اُس کے ہاتھ سے میری قضا کو کیا غرض

اُس کی گلی سے آئے کیوں نکہتِ زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے اُمید مجھ سے صبا کو کیا غرض

یہ تو مرا ہی کام ہے سجدے کروں تو میں کروں
کیوں ترے پاؤں پر گرے زلفِ رسا کو کیا غرض

ماتمِ داغ میں شریک ہو نہ ہو اختیار ہے
گھر سے تمہیں بلائیں کیوں اہلِ عزا کو کیا غرض

میں اور حرفِ شکوہ غلط اے صنم غلط
واللہ جھوٹ ہے یہ خدا کی قسم غلط

آتا ہے وہم لغزشِ مستانہ دیکھ کر
پڑتے ہیں نامہ بر کے ہزاروں قدم غلط

سن سن کے عرضِ حال کی تکرار بار بار
کہنا کسی کا ناز سے وہ دم بدم غلط

تعریفِ حسن سن کے وہ بولے بہت بجا
مضمونِ شوق پڑھ کے کہا یک قلم غلط

بولے وہ داغ آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ
معشوق سے شکایتِ جور و ستم غلط

وہ دیکھتے ہیں بزم میں اغیار کی طرف
میں دیکھتا ہوں چرخِ ستم گار کی طرف

سیلِ سرشک اپنے ہی گھر میں بہائیں گے — کیوں جائے یہ بلا تری دیوار کی طرف
دیکھیں گے حشر میں کیا مجرمانِ عشق — رحمت کہے گی ہم ہیں گنہ گار کی طرف
چاہی تھی داد ہم نے دلِ صاف کی مگر — آئینہ ہو گیا ترے رخسار کی طرف

دی جان کس خوشی سے تہِ تیغ داغ نے
لب پر تبسم اور نظر یار کی طرف

کتابِ عشق کے اُلٹے ورق اول سے آخر تک
مگر سمجھے نہ ہم اس کا سبق اول سے آخر تک

مئے انگور تحفے میں تجھے دیتا ہوں اے زاہد
رہے گا تیز یکساں یہ عرق اول سے آخر تک
ہزاروں دوست دشمن بزم میں اس کی رہے لیکن
رہا اک شکل پر نظم و نسق اول سے آخر تک
بہارِ عارضِ گلگوں سے تیری اس کو کیا نسبت
نہیں اک رنگ پر رہتی شفق اول سے آخر تک
لکھوں اس کو جواب اے داغ کیا میں سخت حیراں ہوں
لکھے ہیں خط میں مضمونِ ادق اول سے آخر تک

کیوں نہ جہاں میں ہو عیاں عیب و ہنر الگ الگ
دیکھتے ہیں بہ چشمِ غور اہلِ نظر الگ الگ
اُس کی تلاش میں مگر ایک کا ایک ہے رقیب
پھرتے ہیں روز و شب جو یوں شمس و قمر الگ الگ

تیغِ نگاہِ یار کو دیتے ہیں ہر گھڑی دعا
پارۂ دل جدا جدا لختِ جگر الگ الگ
رنجِ فراقِ یار بھی صدمۂ روزگار بھی
ایک دل اور اتنے غم چاہیئے گھر الگ الگ
حشر کو اُس نے چن لیے داغؔ گناہ گارِ عشق
تاڑ گئی ہزار میں اُس کی نظر الگ الگ

چھلک گئے ہیں آج اک ساغر سے ہم ہاتھ دھو بیٹھے مئے کوثر سے ہم
قصدِ صحرا ہے دلِ ویراں کے ساتھ اک بیاباں لے چلے ہیں گھر سے ہم
حضرتِ واعظ نے جو چاہا کہا پر نہ بولے کچھ خدا کے ڈر سے ہم
جب رگِ جاں سے کمی کرتا ہے خون پھیر دیتے ہیں اسے نشتر سے ہم
وہ ستم گر روبرو ہوگا تو داغؔ
کیا کہیں گے داورِ محشر سے ہم

میں تو ہر اندازِ معشوقانہ کا دیوانہ ہوں گل پہ بلبل ہوں اگر تو شمع پر پروانہ ہوں
غفلتِ خوابیدگانِ خاک کے اڑتے ہیں ہوش میں شرابِ بےخودی سے اس قدر مستانہ ہوں
مجھ سے اے گبر و مسلماں کس لیے اتنا تپاک قابلِ مسجد نہ ہرگز لائقِ بت خانہ ہوں
ہے سراسر تیرگی اے داغؔ میری روشنی
گو چراغِ خانہ ہوں پر آفتِ کاشانہ ہوں

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں مانندِ آبلہ ہمہ تن آب دیدہ ہوں
سروِ سہی ہوں اور نہ شاخِ خمیدہ ہوں تسلیم و راستی کے لیے آفریدہ ہوں

اللہ رے کشاکشِ دیر و حرم کہ میں ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں
لے آرزوے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں
اے داغ جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

مطلب کی چھیڑ اُن سے پنہاں سخن سخن میں سچ یہ کہ داغِ پُر فن یکتا ہے اپنے فن میں
میں سر بسر ہوں شکوہ اے تیغِ یار تجھ سے سو سو گلے بھرے ہیں ایک ایک عضوِ تن میں
اس رنجِ بے کسی کی یارب خبر نہ پہنچے جائے نہ شامِ غربت سر پیٹتی وطن میں
یہ شوقِ خود نمائی کیا کچھ جنوں سے کم ہے بے تاب تجھ کو لایا خلوت سے انجمن میں
اے داغ ہم نہایت سمجھے اُسے غنیمت
جو دم خوشی سے گزرا یارانِ ہم وطن میں

جوشِ گریہ سے یہ آنکھیں ابرِ نیساں ہو گئیں اب مری بے تابیاں مشہورِ دوراں ہو گئیں
رازِ الفت چھپ سکا ہم سے اُس کے روبرو صاف دل کی حسرتیں منہ پر نمایاں ہو گئیں
جب دیا اُس نے دلاسا شب کو وقتِ اضطراب دل کی وہ بے تابیاں سب راحتِ جاں ہو گئیں
ولولے جوشِ جنوں آخر اُلجھ کر ضعف سے انگلیاں ہاتھوں کی بھی تارِ گریباں ہو گئیں
داغ اب یوسف کہاں لیلیٰ کہاں شیریں کہاں
جو حسین شکلیں تھیں زیرِ خاک پنہاں ہو گئیں

کیا کہا پھر تو کہو دل کی خبر کچھ بھی نہیں کیوں یہ کہا ہے خمِ گیسو میں اگر کچھ بھی نہیں
نہ بصارت نہ اشارت نہ خجالت نہ حیا تجھ میں تو دیکھنے کو دیدۂ تر کچھ بھی نہیں
رات کی رات کا مہماں ہے مریضِ ہجراں صبح تم آئے تو کیا آئے سحر کچھ بھی نہیں

اُن کو بے تاب کیا کچھ نہ کیا نالۂ دل یہ تو لجہ بھی نہ ہوا یہ تو اثر کچھ بھی نہیں

حشر میں دستِ جنوں اسے نہ خجل ہوں اے داغ
کہ مرے پاس بجز دامنِ تر کچھ بھی نہیں

دشتِ وحشت کے لیے تابِ رگِ جاں میں نہیں ہاتھ اُس تار میں اُلجھا جو گریباں میں نہیں
لختِ دل کون سے دن پنجۂ مژگاں میں نہیں مَیں نے وہ پھول چنے ہیں جو گلستاں میں نہیں
پہلے تھی دل میں کھٹک اب تو ہے رگ رگ میں کسک چین اے دردِ تجھے بھی شبِ ہجراں میں نہیں
جلوۂ ہوش ربا دیکھ لیا اے موسیٰ یاں تحیّر میں وہ لذت ہے جو عرفاں میں نہیں

داغ ہم تربتِ مجنوں پہ چڑھاتے چادر
پر یہاں تارِ کفن کو بھی گریباں میں نہیں

کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں
کیا جانیں کیا سکھائیں گے اُن کو صلاحِ کار
ہر روز گفتگو ہے نئی میرے باب میں
گر وہ نہ آئیں گے تو اجل آئے گی ضرور
تسکیں ملی ہوئی ہے مرے اضطراب میں
دنیا کی باز پرس سے اب تک نہیں نجات
اُلجھا ہوا ہوں حشر کے دن بھی حساب میں
اے داغ کوئی مجھ سا نہ ہوگا گناہ گار
ہے معصیّت سے میری جہنم عذاب میں

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں — ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہہ سائی کی — شیخ صاحب نماز کیا جانیں

بل بے چتون تری غضب رے نگاہ — کیا کریں گے یہ ناز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

مانا کہ لطف عشق میں ہے ہم مگر کہاں
کیا سوجھتا نہیں کہ پڑی ہے نظر کہاں

لے آہ دل میں رہ کہ جو پردہ رہے ترا
جاتی ہے دوڑ دوڑ کے تو بے اثر کہاں

الفت جتائیے تو غلط جھوٹ نادرست
دل مانگیے تو کہتے ہیں کیسا، کدھر، کہاں

صورت میں اتحاد تو سیرت میں اختلاف
تجھ سا ہو اور تجھ سا نہ ہو وہ بشر کہاں

مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدے میں صنم خانقاہ میں

دل میں سما گئیں وہ قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اُس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں
آئی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں
مُشتاق اس صدا کے بہت درد مند تھے
اے داغ تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

بات میری کبھی سُنی ہی نہیں
جانتے وہ بُری بھلی ہی نہیں
ہم تو دشمن کو دوست کر لیتے
پر کریں کیا تری خوشی ہی نہیں
ہم تری آرزو پہ جیتے ہیں
یہ نہیں ہے تو زندگی ہی نہیں
دل لگی دل لگی نہیں ناصح
تیرے دل کو ابھی لگی ہی نہیں
داغ کیوں تم کو بے وفا کہتا
وہ شکایت کا آدمی ہی نہیں

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں
اُس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں
وہ مصیبت سنی نہیں جاتی
جس مصیبت کو دیکھتا ہوں میں
نہ محبت کو جانتے ہو تم
نہ مروّت کو دیکھتا ہوں میں
کوئی دشمن کو یوں نہ دیکھے گا
جیسے قسمت کو دیکھتا ہوں میں
حشر میں داغ کوئی دوست نہیں
ساری خلقت کو دیکھتا ہوں میں

بہ سُن سُن کے مرنا پڑا ہر کسی کو
نہیں مرتے دیکھا کسی پر کسی کو

خدا دے تو دے اپنا غم ہر کسی کو | کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو
یہ بجلی نہیں جس کی اک سیر کر لی | تڑپ جاؤ دیکھو جو مضطر کسی کو
بہت چھیڑ کر ہم کو پچھتاؤ گے | ستاتے نہیں بندہ پرور کسی کو

یہ کہتی ہے اے داغ چتون تمہاری
کہ تم چاہتے ہو مقرر کسی کو

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ | بس اب خانہ آباد دولت زیادہ
محبت میں سو لطف دیکھے ہیں لیکن | مزا دے گئی ہے شکایت زیادہ
الٰہی زمانے کو کیا ہو گیا ہے | محبت تو کم ہے عداوت زیادہ
مری بندگی سے مرے جرم افزوں | ترے قہر سے تیری رحمت زیادہ

بہکتے نہ تھے داغ یوں گفتگو میں
مگر پی گئے آج حضرت زیادہ

جب پانو تھکے تو جستجو کی | جب دل نہ رہا تو آرزو کی
مطلب کی کہی نہ ایک ظالم | کیا بات ہے تیری گفتگو کی
ہم بادہ کشوں کی خاک سے بھی | آئے گی صدا سبو سبو کی
کچھ ضبط ہماری خاطر اے چشم | کچھ شرم ہماری آبرو کی

اس خانہ خراب دل میں اے داغ
مٹی ہے خراب آرزو کی

جفا کرتے ہے تو بدلے وفا کے | خدا کو مان اے بندے خدا کے
کسی کے عشق نے کی دل میں گرمی | کھلے رہتے ہیں بند اُن کی قبا کے

نہ خوش ہو اے بتو ہم کو ستا کر　　ڈرو سو کار خانے ہیں خدا کے
ہوئی جاتی ہیں کچھ نیچی نگاہیں　　کہو تو کیا ہے، قربان اس حیا کے

مری مشکل ہوئی اے داغ آساں
تصدق اپنے میں مشکل کشا کے

قول تیرا شوق میرا چاہیے　　جھوٹ سچ کے واسطے کیا چاہیے
گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں　　آج تو کوئی سہارا چاہیے
کیوں نہ چھائے میکشوں کے سر برابر　　کچھ گنہ گاروں کا پردا چاہیے
تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر　　دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

کیوں نہیں دیتے تسلی داغ کو
اس سے لیجے گر تمنا چاہیے

پوچھتا جا مرے مرقد سے گزرنے والے
کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے
چارہ گر لاکھ کا منہ خاک سے بھرنا ہے محال
مشک زخموں میں مرے بھرتے ہیں بھرنے والے
کھولتا کوئی تو چوری سے ترے دل کی گرہ
ہم نے دیکھے ہی نہیں گانٹھ کترنے والے
آپ محشر میں بنیں قول کے سچے کیا خوب
انگلیاں اٹھیں گی وہ آئے مکرنے والے
داغ کہتے ہیں جنھیں دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

وصل کی آرزو کیے نہ بنی — نہ بنی جستجو کیے نہ بنی
شوق نے ہم کلام کر ہی دیا — اُن سے بے گفتگو کیے نہ بنی
اس نے جب شکوہ کر لیں تسلیم — ہم کو بے سر فرو کیے نہ بنی
پاک ہونا ہے رند کو لازم — مے کشی بے وضو کیے نہ بنی
اُس کی تصویر سے بھی تھا یہ خوف
داغ کو گفتگو کیے نہ بنی

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے
مجھے یہ ڈر ہے کہ ایمان لے نہ آئیں لوگ
خدا کرے غلطی کچھ مرے سخن میں رہے
ملے جو بے وطنی میں ذرا بھی آسائش
عقیق جا کے عدن میں گہر یمن میں رہے
ترا وہ حسن ہے اے شعلہ رو جو تو چاہے
بغیر شمع کے پروانہ انجمن میں رہے
مسافری میں جب آرام پاؤ گے اے داغ
کہ تم سفر میں رہو آسماں وطن میں رہے

غم اُٹھانے کے واسطے دم ہے — زندگی ہے اگر تو کیا غم ہے
آئے ہیں وہ رقیب کے گھر سے — اک خوشی ہے تو ایک ماتم ہے
کہتے ہو کچھ کہو، کہوں کیا خاک — جانتا ہوں مزاج برہم ہے
کیا نئے دوستوں سے بگڑی آج — دشمنوں کا کچھ اور عالم ہے

سنتے ہیں داغ کل وہ آئے تھے　　بارے اب تو سلوک باہم ہے

دوست خوش ہونے لگے دوست کے مر جانے سے
غم کا یہ کال پڑا ہے مرے غم کھانے سے
چور ہو جاؤں مگر جاؤں نہ مے خانے سے
عہد شیشے سے تو پیمان ہے پیمانے سے
روح کس مست کی پیاسی گئی مے خانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے
سختیاں کھینچنے کی ہو گئی عادت دل کو
بت چلے آئیں نہ کھنچ کر کہیں بت خانے سے
ایک چلو میں بہت داغ بہک اٹھے تھے
آج سنتے ہیں نکالے گئے مے خانے سے

نئی شوخی ہے چشم فتنہ زا کی　　تغافل یوں کیا گویا حیا کی
شب اندوہ غم کا پوچھنا کیا　　بنا کی جو مرے دم پر بنا کی
جواب قتل کیا قاتل نے سوچا　　کہ اس کو عید ہے روز جزا کی
مٹاؤں داغ ہجراں دل سے کیونکر　　وہ پوچھیں گے نشانی میری کیا کی
پھر اس بت پر فدا ہیں حضرت داغ
قسم کھائی تھی کعبے میں خدا کی

ہجر آفت ہے اگر وصل بلائے دل ہے　　آدمی کے لیے ہر طرح غرض مشکل ہے
ہم نے جو راز کے خلوت میں کہا تھا اس سے　　آج افشا وہ رقیبوں میں سر محفل ہے

اے غم یار کوئی اپنا ٹھکانا کر لے — دل تو پُر درد ہے تو درد کے کیوں شامل ہے
شمع چپ آئنہ حیران ہے عاشق ششدر — واہ کیا عالم تصویر تری محفل ہے
ہم کو قسمت نے دیا داغ تمنا اے داغؔ
وہی ملتا ہے جس انعام کے جو قابل ہے

چھوڑا ہے ساتھیوں نے پس کارواں مجھے
لے جائے دیکھیے مری وحشت کہاں مجھے
شب کو نہ آئے تم تو دل بدگماں مجھے
واں لے گیا کہ موت ہے جانا جہاں مجھے
کیا دردِ دل کہوں کہ سراپا ہوں دردمند
آتی نہیں ہے بات سوائے فغاں مجھے
پڑتی ہے اُن کی آنکھ سرِ بزم جب کہیں
جاتے ہیں اِک نگاہ پہ سو سو گماں مجھے
اے داغؔ اس کے ہاتھ سے گر ہوں شہید میں
وہ موت بھی ہو زندگئ جاوداں مجھے

رنج و قلق کہ صدمہ و ایذا اُٹھائیے — دل کو بٹھا کے سینے میں کیا کیا اُٹھائیے
یوں خاک میں ملائیے اس شوقِ چشم کو — پلکوں سے اس کا نقشِ کفِ پا اُٹھائیے
اے ناتوانئ دلِ بیمار الاماں — طاقت نہیں کہ دل سے تمنا اُٹھائیے
ہر چند کوہ سے بھی گراں تر ہے بارِ عشق — ہمت یہ کہہ رہی ہے کہ تنہا اُٹھائیے
وہ داغؔ دردمند جو کل تک مریض تھا
آج آپ آکے اس کا جنازا اُٹھائیے

بھلا ہو پیرِ مغاں کا اِدھر نگاہ ملے
فقیر ہیں کوئی چُلّو خدا کی راہ ملے
وہ روزِ حشر ہے دنیا نہیں کہ راہ ملے
کہاں چھپو گے جو دو چار داد خواہ ملے
ہوا ہے دردِ جگر سے یہ گھر مرا تاریک
کہ موت ڈھونڈتی پھرتی ہے کوئی راہ ملے
اثر کہاں سے ملے جب یہ چھوٹ ہو باہم
الگ الگ رہے دونوں نہ حرفِ آہ ملے
نویدِ بخششِ عصیاں اُسے سُنا دینا
جو شرمسار کہیں داغِ روسیاہ ملے

آفتابِ داغ

(۱۸۸۵ء)

عرصۂ حشر میں انصاف ہمارا کیسا — دیکھنا یہ ہے کہ ہوتا ہے تماشا کیسا
ڈوبتے ہیں عرقِ شرم میں غیرت والے — ڈوب مرنے ہی پہ جب آئے تو دریا کیسا
دیکھتے ہو طرفِ سنگِ در آتے جاتے — مجھ کو دیکھو کہ ہوا ناصیہ فرسا کیسا
مجھ کو یہ شکوہ کہ اقرارِ وفا جھوٹا تھا — اُن کو یہ ناز کیا ہم نے یہ وعدا کیسا
غیر کا ذکرِ وفا اور ہمارے آگے
داغ اِس بات سے جلتا ہے کلیجا کیسا

زباں پر اُن کی جو بھولے سے نام تو آیا — اُٹھا کے آئنہ دیکھا وہیں غرور آیا
کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے نہ کہا — وہ چمکی برقِ تجلّی وہ کوہِ طور آیا
تری گلی میں رہی بازگشت مثلِ نفس — کہ جتنی دور گیا واپس اتنی دور آیا
خدا نے بخش دیے حشر میں بہت عاشق — خیالِ یار میں کوئی نہ بے قصور آیا
وہیں سے داغِ سیہ بخت کو ملی ظلمت — جہاں سے حضرتِ موسیٰ کے ہاتھ نور آیا

انکارِ مے کشی نے مجھے کیا مزا آیا ـــ سینے پہ چڑھ کے اُس نے خُمِ مے پلا دیا
احسان مانتا ہوں ستم ہائے غیر کا ـــ بگڑا ہوا مزاج تمہارا بنا دیا
وہ نامرادِ لطفِ اسیری ہوں، ہم صفیر ـــ صیّاد نے بھی مجھ کو چمن سے اُڑا دیا
تعریفِ حور اور پھر اس شدّومد کے ساتھ ـــ میری زبان نے مجھے جھوٹا بنا دیا

بخشا گیا جو داغِ سیہ کار دیکھنا
جنّت کہے گی "آگ لگا دی جلا دیا"

بلا سے جو دشمن ہوا ہے کسی کا ـــ وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا
ذرا ڈال دو اپنی زلفوں کا سایہ ـــ مقدّر بہت نارسا ہے کسی کا
مری التجا پر بگڑ کر وہ بولے ـــ نہیں مانتے اس میں کیا ہے کسی کا
وہ کرنے لگے ہیں قیامت کی باتیں ـــ یہ سچ ہے تو بس فیصلا ہے کسی کا

بظاہر نہ جانے نہ جانے نہ جانے
تجھے داغ دل جانتا ہے کسی کا

غیر کو منہ لگا کے دیکھ لیا ـــ جھوٹ سچ آزما کے دیکھ لیا
اُن کے گھر داغ! جا کے دیکھ لیا ـــ دل کے کہنے میں آکے دیکھ لیا
اِدھر آئینہ ہے اُدھر دل ہے ـــ جس کو چاہا اُٹھا کے دیکھ لیا
اُن کو خلوت سرا میں بے پردہ ـــ صاف میدان پا کے دیکھ لیا

داغ نے خوب عاشقی کا مزا
جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا

اس کی محفل سے کہوں کیا دل کو کیوں کر لے چلا ـــ ہار کر اک بار چھوڑا پھر مکرّر لے چلا

آدمی کی کیا ہے طاقت جو ہوا کا ساتھ دے ٹھوکریں کھا کر گرا جب مجھ کو رہ بر لے چلا
آنسوؤں کا قافلہ چلنے لگا نالے کے ساتھ یہ جرس آواز پر اپنی لگا کر لے چلا
اُس کی چتون پھرتے ہی محفل میں ہل چل پڑ گئی مضطرب کو مضطرب، مضطر کو مضطر لے چلا
یہ حسیں، یہ مہ جبیں، یہ شہر، ایسی لہر بہر
داغؔ کلکتے سے لاکھوں داغِ دل پر لے چلا

رُکے جو کام تو بے داد رس نہیں چلتا پرائے بس میں ہے کچھ اپنا بس نہیں چلتا
ہمارے سینے میں بیرون نفس نہیں چلتا جب اُس نے روک دیا کہہ کے 'بس' نہیں چلتا
بہت ہمارے پھڑکنے سے تنگ ہے صیاد کہ چار دن سے زیادہ قفس نہیں چلتا
گزر گئے ہیں جو دن پھر نہ آئیں گے ہرگز کہ ایک چال فلک ہر برس نہیں چلتا
ملے جو داغؔ تو کیسا بنائیں ٹھیک اُسے
ہزار کوس سے کچھ اُن کا بس نہیں چلتا

کہو جب تم کہ ہے بیمار میرا تو کیوں کر دور ہو آزار میرا
بُرائی میں بھی ہو گا کوئی مطلب وہ کرتے ذکر کیوں بے کار میرا
کہوں گا حشر میں یہ کون ہیں کون مزا دے جائے گا انکار میرا
قیامت ہے، سنے وہ سر جھکائے خدا کے سامنے، اظہار میرا
مجھے تم جانتے ہو داغؔ ہوں میں
کہیں جاتا ہے خالی وار میرا

بُخار اچھا نکالا سوزِ دل نے چشم گریاں پر کہ ہر آنسو برنگِ آبلہ ہے نوکِ مژگاں پر
نمودِ صبح تک کیا جانے کیا کیا رنگ بدلے گی ابھی سے بے کسی چھائی ہے میری شامِ ہجراں پر

ہجوم یاس و نومیدی و فورِ حسرتِ ارماں
چڑھائی لشکرِ غم کی ہے اک جانِ پُر ارماں پر
وہ پیکاں تشنۂ خوں ہے جگر میں دم نہیں باقی
غضب ہے مفلسی نازل ہوئی جاتی ہے مہماں پر
یہ خونِ داغ ہے ہرگز نہیں چھٹنے کا اے قاتل
کہ اس کا حشر تک غبار رہے گا تیرے داماں پر

جب کہیں جاتے ہو آتے ہو پشیماں ہوکر
تم کو جانا نہیں آتا ابھی مہماں ہوکر
خیر بہتر ہے تغافل ہی سہی سن لینا
جان پر کھیل گیا کوئی پریشاں ہوکر
تیری حسرت مجھے لائی ہے تری محفل میں
میں نہ نکلوں گا کبھی غیر کا ارماں ہوکر
تجھ کو معلوم بھی ہے رات کو در پر تیرے
نالے کرتا ہے کوئی رمز غزل خواں ہوکر
داغ تو کعبے سے جاتا ہے جو بت خانے کو
شرم آتی نہیں کم بخت مسلماں ہوکر

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں
خدا رکھے سلامت جن کو ان کو موت کب آئے
تڑپتے لوٹتے ہم کوچۂ قاتل میں رہتے ہیں
محیطِ عشق کی ہر موج طوفاں خیز ایسی ہے
وہ ہیں گرداب میں جو دامنِ ساحل میں رہتے ہیں
بتوں کو محرمِ اسرار تو نے کیوں کیا یارب
کہ یہ کافر ہر اک خلوت سرائے دل میں رہتے ہیں
کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

دردِ دل کا کوئی پہلو جو نکالوں تو کہوں
اپنے روٹھے ہوئے دلبر کو منالوں تو کہوں
میں نے جو پائی ہے اس تیغِ ادا میں لذت
سامنے خضر و مسیحا کو بٹھالوں تو کہوں
شبِ ہجراں میں جو کچھ اس سے ہوئی ہیں باتیں
تیری تصویر کو سینے سے لگالوں تو کہوں

جو گزرتی ہے مرے دم پہ نہ پوچھو مجھ سے　　گالیاں عشق و محبت میں سُناؤں تو کہوں

داغؔ پابندِ قفس ہوں نہیں کچھ کر سکتا
دامِ صیاد سے میں چھوٹ کے جاؤں تو کہوں

اس کی شرارتیں بھی قیامت سے کم نہیں　　دل تجھ سے بڑھ کے ہے کسی صورت سے کم نہیں
دنیا میں اِن بتوں نے جلایا ہے اس قدر　　دوزخ بھی میرے واسطے جنّت سے کم نہیں
یہ ناز یہ نگاہ یہ چھل بل یہ شوخیاں　　تم اُس سے بھی سوا ہو قیامت سے کم نہیں
اس کا ثواب لوٹنے والے ہمیں تو ہیں　　نظّارہ بُت کدے کا عبادت سے کم نہیں

تو نے دیا فروغ تو ہے داغؔ آفتاب
ذرّہ بھی ورنہ اس کی حقیقت سے کم نہیں

پھنسی ہوئی ہے یہ گردن بتوں کے پھندوں میں　　چھُڑا دے کوئی ہوا تنا خدا کے بندوں میں
اُسی سے ہوتے ہیں انداز بے نیازی کے　　جو ہے قدیم تمہارے نیاز مندوں میں
خدا کا ذکر تو اُس بت کے سامنے کرتے　　مگر وہ ایک ہی کافر ہے خود پسندوں میں
نکال لیتے ہیں رو رو کے ہم بھی دل کا بخار　　جو بیٹھ جاتے ہیں دو چار درد مندوں میں

ہوئی ہے داغؔ محبت میں تھوڑی رسوائی
یہ منھ دکھانے کے قابل ہے بھائی بندوں میں

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں　　اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں
یارب اُس چاند کے ٹکڑے کو کہاں سے لاؤں　　روشنی جس کی ہو ان تاروں بھری راتوں میں
کیا قیامت ہے اُس ارمان بھرے کی حسرت　　ایک شب جس کو میسر نہ ہو سو راتوں میں
ہم سے انکار ہوا غیر سے اقرار ہوا　　فیصلہ خوب کیا آپ نے دو باتوں میں

وہ گئے دن جو رہی یاد بتوں کی اے داغ
رات بھر اب تو گزرتی ہے مناجاتوں میں

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں
فسوں ہے یا دعا ہے یا معمّا کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں
بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں
قسم دے کر انھیں سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اُن کے
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں
کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

ممکن نہیں کہ تیری محبت کی بو نہ ہو
کافر اگر ہزار برس دل میں تو نہ ہو
محشر میں اور اُن سے مری دو بدو نہ ہو
کہنے کی بات ہے جو کوئی گفتگو نہ ہو
قاتل اگر نہ شوخ ہو خنجر اگر نہ تیز
رگ رگ میں بے قرار ہمارا لہو نہ ہو
ایسے کہاں نصیب کہ وہ بت ہو ہم کلام
ہم طور پر بھی جائیں تو کچھ گفتگو نہ ہو
اے داغ آکے پھر گئے وہ اس کو کیا کریں
پوری جو نامراد تیری آرزو نہ ہو

آئے بھی تو وہ منہ کو چھپائے مرے آگے
اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے

کیا دم کا بھروسا ہے پھر آئے کہ نہ آئے — جانا ہو جو قاصد کو تو جائے مرے آگے

تیور یہی کہتے ہیں کہ یہ نام ہے میرا — لکھ کر کئی حرف اُس نے مٹائے مرے آگے

بچھڑے ہوئے معشوق ملیں سب کو الٰہی — تنہا کوئی جنت میں نہ جائے مرے آگے

کچھ داغ کا مذکور جو آیا تو وہ بولے
آئے تھے بُرا حال بنائے مرے آگے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی — بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی — وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

سنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو — وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

دنیا میں کوئی لطف کرے یا جفا کرے — جب میں نہیں بلا سے مری کچھ ہوا کرے

اس جور پر وفا نہ کرے یا وفا کرے — میری جگہ نصیب سے تم ہو تو کیا کرے

آتے ہی اُن کو ہوش قیامت بپا ہوئی — مانگی تھی کیوں دعائیں کہ یہ دن خدا کرے

مجھ کو پسند آ گئی دیوانگی مری — تیری خوشی سے کام کوئی کچھ کیا کرے

اس عشق میں کسی کا اجارا نہیں ہے داغ
پروردگار جس کو یہ نعمت عطا کرے

میری فریاد دوسرا نہ سُنے — تم سُنو اے بتو خدا نہ سُنے

راز اپنا کبھی کہا نہ کہے — حال میرا کبھی سُنا نہ سُنے

خوب رو وہ جسے زمانہ کہے گفتگو وہ جسے زمانہ سنے
ہجر میں جو دعائیں مانگی ہیں کوئی اللہ کے سوا نہ سنے
داغ کو چین ہی نہیں آتا
اُس سے جب تک بُرا بھلا نہ سنے

وہ نگہ زاہد کے دل سے آشنا ہونے لگے سیر تو جب ہے کہ دونوں میں ذرا ہونے لگے
غیر کے مذکور پر میرا بگڑنا تھا بجا ٹھہرو ٹھہرو سنبھلو کیا سے کیا ہونے لگے
سخت گردش، ناامیدی ہم سفر منزل بعید عاقبت تھک تھک کے نالے نارسا ہونے لگے
میہمانوں کو بلاتے ہیں خوشی کے واسطے تم تو آتے ہی بگڑ بیٹھے خفا ہونے لگے
داغ میں پرچا ہی لوں گا باتوں باتوں میں انھیں
شرط یہ ہے میرا اُن کا سامنا ہونے لگے

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی آپ سے تم، تم سے تو ہونے لگی
چاہیے پیغام بر دونوں طرف لطف کیا جب دوبدو ہونے لگی
ناامیدی بڑھ گئی ہے اس قدر آرزو کی آرزو ہونے لگی
اب کے مل کر دیکھیے کیا رنگ ہو پھر ہماری جستجو ہونے لگی
داغ اترائے ہوئے پھرتے ہیں آج
شاید ان کی آبرو ہونے لگی

ناروا کہیے نا سزا کہیے کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے
پھر نہ رُکیے جو مدعا کہیے ایک کے بعد دوسرا کہیے
وہ مجھے قتل کر کے کہتے ہیں مانتا ہی نہ تھا یہ کیا کہیے

آگئی آپ کو مسیحائی مرنے والوں کو مرحبا کہیے
ہوش جاتے رہے رقیبوں کے
داغ کو اور باوفا کہیے

فغاں کو لاگ ٹھہری آسماں سے اُٹھا جاتا ہے پردہ درمیاں سے
گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے چلے آتے تھے گھبرائے کہاں سے
لگا رہتا ہے کھٹکا دونوں جانب مزہ ہے دوستی کا بدگماں سے
وہ خط لکھیں مجھے جھوٹا ہے قاصد خدا جانے اُٹھا لایا کہاں سے
جہان آباد ہر منزل ہے اے داغ
قدم باہر نکالا جب مکاں سے

ہاے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی روز معشوق نیا روز ملاقات نئی
بات کرتی نہیں لے لیتی ہے چٹکی دل میں یہ تو ہے آپ کی تصویر میں اک بات نئی
دل طلب کرتے ہو مہمان بُلا کر ہم کو یہ تواضع ہے نئی ہے یہ مدارات نئی
سر مرا کاٹ کے اے نامہ رساں لیتا جا گرچہ بے کار سہی پر ہے یہ سوغات نئی
داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی

ملتے ہی بے باک تھی وہ آنکھ شرمائی ہوئی
پھر گئی برچھا کے پلکوں تک حیا آئی ہوئی
ہر ادا مستانہ سر سے پانو تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

آسماں نے خاک کی چٹکی ہر اک فتنے کو دی
میری تربت ہے یہ کن قدموں کی ٹھکرائی ہوئی
ٹوٹ کر رستے میں پیار آ ہی گیا اُس شوخ پر
وہ نظر حیرت زدہ وہ آنکھ شرمائی ہوئی
دیکھ کر قاتل کی آمد داغؔ دل میں شاد شاد
اور غم خواروں کے منہ پر مردنی چھائی ہوئی

جب ترے در سے پھرا خلقت تماشائی ہوئی
پیچھے پیچھے داغؔ آگے آگے رسوائی ہوئی
لیں قیامت میں بلائیں اُس سراپا ناز کی
صدقے رعنائی ہوئی قربان زیبائی ہوئی
بت کدے میں سجدہ کرنا کفر اے واعظ نہیں
گر یہیں مقبول اپنی جبہہ فرسائی ہوئی
دوست دشمن کو بنایا ہے ترے انداز نے
سب کو پہچانا اگر تجھ سے شناسائی ہوئی
چل دیا اے داغؔ کیا منہ پھیر کر وہ مہ جبیں
پھر گئی تقدیر میرے سامنے آئی ہوئی

یوں چلیے راہِ شوق میں جیسے ہوا چلے
ہم بیٹھ بیٹھ کر جو چلے بھی تو کیا چلے
موسیٰ کی طرح راہ میں پوچھے نہ رازِ دوست
خاموش خضر ساتھ ہمارے چلا چلے
افسانۂ رقیب بھی لو بے اثر ہوا
بگڑے جو سچ کہے سے وہاں جھوٹ کیا چلے
رکھّا دل و دماغ کو تو روک تھام کر
اس عمرِ بے وفا پہ مرا زور کیا چلے

بیٹھا ہے اعتکاف میں کیا داغ روزہ دار
اے کاش مے کدے کو یہ مردِ خدا چلے

کس دلِ بے تاب کی یارب تماشائی ہوئی
وہ نگاہِ شوخ کچھ پھرتی ہے گھبرائی ہوئی
ہائے وہ دنیا کہاں وہ عیب پوشی اب کہاں
عرصۂ محشر میں رسوائی سی رسوائی ہوئی
اے ہجوم ناامیدی رکھ لے شرم آرزو
گوشۂ دل میں الگ بیٹھی ہے شرمائی ہوئی
یہ ملا ذکرِ قیامت پر قیامت کا جواب
کیا اُٹھے گی وہ ہماری ٹھوکریں کھائی ہوئی
ہے عجب اندھیر کوئی داغ کا پرساں نہیں
صبحِ محشر بھی الٰہی شامِ تنہائی ہوئی

مہتابِ داغؔ

(تکمیلِ کتابت ۲۳ دسمبر ۱۸۹۳ء)

یہ مجھ سے کہنے کو ظالم سرِ مزار آیا — مرے بغیر تجھے کس طرح قرار آیا
یہ حال تھا شبِ وعدہ کہ تا بہ راہ گزر — ہزار بار گیا میں ہزار بار آیا
گزر گئے اسی گردش میں اپنے لیل و نہار — شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا
یہ عقدہ عاشق و معشوق کے جدا ہونے سے کھلا — سمجھ میں مسئلۂ جبر و اختیار آیا
ڈرے جو حشر میں وہ مجھ کو دیکھتے ہی کہا
مرا رفیق مرا داغِ جاں نثار آیا

نام زیرِ آسماں باقی رہا — مرمٹوں کا یوں نشاں باقی رہا
اس کے در پر جبہ سا لاکھوں ہوئے — پھر بھی سنگِ آستاں باقی رہا
دیکھیے فردائے محشر کیا بنے — آج کل پر امتحاں باقی رہا
حال کچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ — حال مجھ میں اب کہاں باقی رہا
جا چکا اے داغؔ سب مال و متاع — شکر ہے لطفِ زباں باقی رہا

لے چلا جان مری روٹھ کے جانا تیرا ‏ — ‏ ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

تو جو اے زلف پریشان رہا کرتا ہے ‏ — ‏ کس کے اجڑے ہوئے دل میں ہے ٹھکانا تیرا

یہ سمجھ کر تجھے اے موت لگا رکھا ہے ‏ — ‏ کام آتا ہے برے وقت میں آنا تیرا

اپنی آنکھوں میں ابھی کوند گئی بجلی سی ‏ — ‏ ہم نہ سمجھے کہ یہ آنا ہے کہ جانا تیرا

داغ کو یوں وہ مٹاتے ہیں یہ فرماتے ہیں
تو بدل ڈال، ہوا نام پرانا تیرا

قسمت اس کی ہے کہ جس نے تجھے پایا تنہا ‏ — ‏ خواب میں بھی تو مرے ڈر سے نہ آیا تنہا

میرے ہمراہ مرے دوست بھی غم کھاتے ہیں ‏ — ‏ خاک کھایا جو کسی شخص نے کھایا تنہا

کون ہے کس کی زمانے میں خبر لیتا ہے ‏ — ‏ دل نے سینے میں بہت شور مچایا تنہا

ساتھ لا کر وہ رقیبوں کو یہ فرماتے ہیں ‏ — ‏ کیا سبب تھا جو مجھے تو نے بلایا تنہا

رازداروں کو رفیقوں کو خبر کرنی تھی
داغ تم نے تو وہاں رنگ جمایا تنہا

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا ‏ — ‏ دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

تغافل سے بڑھ کر بھی کیا جور ہوگا ‏ — ‏ ستم ہو چکا یا ابھی اور ہوگا

نہ عاشق کو شکوہ نہ معشوق سرکش ‏ — ‏ الٰہی وہ کیا عہد کیا دور ہوگا

کسی کا نہ ہوگا قیامت میں کوئی ‏ — ‏ زمیں اور ہوگی فلک اور ہوگا

عیادت کو وہ داغ کی خوش خوش آئے
یہ جانا کہ اب طور بے طور ہوگا

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا ‏ — ‏ نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا

وہ قتل کر کے مجھے ہر کسی سے پوچھتے ہیں — یہ کام کس نے کیا ہے یہ کام کس کا تھا
رہا نہ دل میں وہ بے درد اور درد رہا — مقیم کون ہوا ہے مقام کس کا تھا
ہمارے خط کے تو پرزے کیے پڑھا بھی نہیں — سنا جو تو نے بدل وہ پیام کس کا تھا

ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا
یہ پوچھے ان سے کوئی وہ غلام کس کا تھا

زمیں سے قدم عرش پر لے گیا — فرشتوں سے بازی بشر لے گیا
شکایت سنی آج کیا کیا تری — کہ دشمن مجھے اپنے گھر لے گیا
برے وقت کا کوئی ساتھی تو ہو — مجھے بھی مرا نامہ بر لے گیا
ترے ہاتھ دل بیچتا کیوں رقیب — وہ ہشیار تھا پھیر کر لے گیا

یہ کیا ایسی وحشت اٹھی داغ کو
اٹھا کر کہاں گھر کا گھر لے گیا

ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا — کنکھیوں سے اس کو مگر دیکھ لینا
کہیں ایسے بگڑے سنورتے بھی دیکھے — نہ آئیں گے وہ راہ پر دیکھ لینا
تغافل میں شوخی نرالی ادا تھی — غضب تھا وہ منہ پھیر کر دیکھ لینا
نہیں رکھنے دیتے جہاں پاؤں ہم کو — اسی آستانے پہ سر دیکھ لینا

جلایا تو ہے داغ کے دل کو تم نے
مگر اس کا ہوگا اثر دیکھ لینا

دل مکدر مدام کا نکلا — کب یہ آئینہ کام کا نکلا
گھر سے تم کیوں نکالے دیتے ہو — کیا قصور اس غلام کا نکلا

گالیاں سُنتے ہیں دُعا دے کر — خوب پہلو کلام کا نکلا
دل کے ملنے کی پھر اُمید نہیں — یہ اگر اُس کے نام کا نکلا
سچ تو یہ ہے کہ عاشقی میں داغ
ایک ہی اپنے نام کا نکلا

شوق ہے اُس کو خود نمائی کا — اب خدا حافظ اس خدائی کا
پھنس گیا دل بُری جگہ افسوس — کوئی پہلو نہیں رہائی کا
بت کدے کی جو سیر کی ہم نے — کارخانہ ہے اک خدائی کا
گرچہ پہنچا ہوں میں کہیں سے کہیں — مرحلہ دُور ہے رسائی کا
نہ رہا لطف اس زمانے میں
میرزا داغ میرزائی کا

تم کو کیا ہر کسی سے ملنا تھا — دل ملا کر مجھی سے ملنا تھا
پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر — اک نئے آدمی سے ملنا تھا
عید کو بھی خفا خفا ہی رہے — آج کے دن خوشی سے ملنا تھا
آپ کا مجھ سے جی نہیں ملتا — اس محبت پہ جی سے ملنا تھا
تم تو اکھڑے رہے تمہیں اے داغ
ہر طرح مدعی سے ملنا تھا

نہیں سنتے وہ اب ہماری بات — سچ ہے بن آئے کب ہے ساری بات
دو دو باتیں ہوئی تھیں واعظ سے — رکھ لی اللہ نے ہماری بات
خیر سے اس نے بھی نہ پوچھا حال — کہنے دیتی نہ بے قراری بات

خامشی میں ادا کریں مطلب ۔۔۔ یہ تو ہے اُن کی اختیاری بات
لوٹ لیتی ہے داغ کے دل کو
تیری ہر ایک پیاری پیاری بات

ملی ہم کو جنت قیامت کے بعد ۔۔۔ ملے کیا خدا جانے جنت کے بعد
حیا کے تبسم کے اغماض کے ۔۔۔ مزے لے رہا ہوں شکایت کے بعد
لڑیں گے وہ حوروں سے فردوس میں ۔۔۔ یہ فتنہ اُٹھے گا قیامت کے بعد
مرے حال پر رحم آ ہی گیا ۔۔۔ وہ چل کر پلٹ آئے رخصت کے بعد
تڑپنا نہ دیکھا گیا داغ کا
ہوا خاتمہ کس مصیبت کے بعد

کہتے ہیں وہ یہ دشمنِ گل نوبہار پر ۔۔۔ طرّہ ہے اپنی ایک جوانی ہزار پر
اس کو مٹا نہ دیجیے بے داد آپ کی ۔۔۔ اب بھی ہے کرم ستمِ روزگار پر
تڑپائیں تا بہ حشر اگر ان کا بس چلے ۔۔۔ لوٹے ہوئے ہیں میرے دلِ بے قرار پر
اٹھنے سے دل میں ایک زمانے کی خواہشیں ۔۔۔ بھولا ہوا ہوں زندگیِ مستعار پر
امید اس کی ذات سے اے داغ چاہیے
سب منحصر ہے رحمتِ پروردگار پر

مزا دے گیا ہے شباب اول اول ۔۔۔ ملے خوب رو انتخاب اول اول
وہ کب لطف کرتے ہیں بے آزمائے ۔۔۔ کرم آخر آخر عتاب اول اول
خدا شرم رکھے تری انتہا تک ۔۔۔ کہ ڈالی ہے منہ پر نقاب اول اول
انھیں سے پھر آخر کو کھل کھیلتے ہیں ۔۔۔ وہ کرتے ہیں جن سے حجاب اول اول

ہوئی داغ اب اُن کی تعبیر اُلٹی
نظر آئے جو ہم کو خواب اوّل اوّل

مقتضائے وقت کہ پابندِ ہر حالت میں ہوں — میں زمیں پستی میں ہوں تو آسماں رفعت میں ہوں
کیوں ہوا جاتا ہے دل بیران بتوں کا اختیار — میں تو یا اللہ تیرے قبضۂ قدرت میں ہوں
جلوۂ دیدار کو ہے خود نمائی سے غرض — اور میں کم بخت بے خود شوق کی حالت میں ہوں
خار دامن گیر ہیں اہلِ وطن سے بھی سوا — میں عزیزِ اہلِ وحشت وادیٔ غربت میں ہوں

شاہ میرا قدرداں، احباب میرے مہرباں
ہیں دکن میں جب سے ہوں اے داغ! اک جنت میں ہوں

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں — تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں
پھرے بت کدے سے تو اے اہلِ کعبہ — پھر آکر تمہارے قدم دیکھتے ہیں
نہ یارائے [illegible] نہ اظہارِ مطلب — مرے منہ کو اہلِ کرم دیکھتے ہیں
کبھی توڑتے ہیں وہ خنجر کو اپنے — کبھی نبضِ بسمل میں دم دیکھتے ہیں

تمہیں داغ کیا کم ہے یہ سرفرازی
کہ شاہِ دکن کے قدم دیکھتے ہیں

ان کو دماغِ صبر و تحمل تھا [illegible] — دم آخر کے بعد اور خط آیا جواب میں
یارب نہ پوچھ [illegible] محشر میں [illegible] — کرنا ہو [illegible] حجاب کی باتیں حجاب میں
آؤ نہ اتنی دیر نہیں تم کریں گے کیا — رہنے بھی دو ابھی ہے تو وقتِ حساب میں
پوچھے تو کوئی حضرتِ واعظ سے اتنی بات — ایسے نہ تھے جناب بھی عہدِ شباب میں
کچھ ہوش ہو تو داغ کو سمجھائیں ایک دم — ڈوبا ہوا ہے نشّۂ جامِ شراب میں

زلفیں رخسار پر نہ آئیں کیوں | اشک کرتے چھپے پڑیں بانہیں کیوں
غیر باتوں میں زہر اگلتا ہے | آپ کی جھوٹی سچ بتائیں کیوں
مے اگر تیز ہے تو اے ساقی | آگ پانی میں ہم لگائیں کیوں
جب تڑپتا ہے کوئی کہتے ہیں | ہم چپیاں بن گئیں ادائیں کیوں

جان پر کیا بنی کہو تو سہی
داغ پردے میں مسکرائیں کیوں

دل مفت لوں ہرگز نہ دوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں
اس کے سوا بھی شوق لوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں
جو یہ کہیں اچھا ہے تو اس سے کہوں جھوٹا ہے تو
کیوں کر نہ ہو حالت زبوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں
کہتا ہے ناصح کر دوا نجد کو تیشہ میں ہے مزا
کس طرح دل کو ہو سکوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں
کیا دیکھیے ہو وقت پر قاصد چلا ہے سوچ کر
وہ یہ کہیں میں یوں کہوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں
وہ چاہتا ہے فصل ہو میں چاہتا ہوں وصل ہو
اے داغ کس آفت میں ہوں وہ یہ کہیں میں یوں کہوں

جل کے ٹھنڈے ہوئے ترے غم میں | ہم کو جنت ملی جہنم میں
کچھ ترا شوق تھا کچھ تری حسرت | اور رکھا ہی کیا ہے اب ہم میں
دل کی قیمت بہت ہے نیم نگاہ | یہ تو آئے گا اس سے بھی کم میں
اب نزاکت ہے کیوں خدا کے لیے | کون سی بات بڑھ گئی ہم میں

داغ کو وہ جلا کے کہتے ہیں
ہم نے روشن کیا ہے عالم میں

کل جو تھا آج وہ مزاج نہیں — اس تلوّن کا کچھ علاج نہیں
بے نیازی کی شان کہتی ہے — بندگی کی کچھ احتیاج نہیں
یاس نے کیا بجھا دیا دل کو — کہ تڑپ کیسی اختلاج نہیں
حور سے پوچھتا ہوں جنت میں — اس جگہ کیا بتوں کا راج نہیں
صبر بھی دل کو داغ دے لیں گے
ابھی کچھ اس کی احتیاج نہیں

اسیرِ دامِ بلا اور کون ہے میں ہوں — شکارِ تیرِ جفا اور کون ہے میں ہوں
نہاں ہے آئی شبِ غم صدا تسلی کی — یہاں تو یارِ خدا اور کون ہے میں ہوں
مجھے تو رنج نہ دے تو کہ اے دلِ ناداں — جہاں میں دوست ترا اور کون ہے میں ہوں
ستم شریکِ فلک اور کون ہے تم ہو — شریکِ اہلِ وفا اور کون ہے میں ہوں
وہ داغ جس کو گلِ باغِ عشق کہتے ہیں
بہارِ رنگِ وفا اور کون ہے میں ہوں

کیوں کر نہ کروں شورِ مناجات سے توبہ — آغاز ہو جب چار گھڑی رات سے توبہ
زاہد نے چھپایا ہے اُسے گوشۂ دل میں — بھاگی تھی کسی رندِ خرابات سے توبہ
کیوں کر وہ اِدھر آئے کہ اے حضرتِ زاہد — بجتی ہی نہیں قبلۂ حاجات سے توبہ
اُمید ہے مجھ کو یہ ندا آئے دمِ مرگ — مقبول ہوئی اس کی عنایات سے توبہ
یہ داغِ قدح خوار کے کیا دل میں سمائی — سنتے ہیں کیے بیٹھے ہیں وہ رات سے توبہ

عشق میں عیش کے بدلے یہ تباہی کیسی پھنس گئی جان مصیبت میں الٰہی کیسی
چاہتے ہو مری چاہت کا رقیبوں سے ثبوت جب ہو مجرم کو خود اقبال گواہی کیسی
جب نہیں مال تو اس کا تمہیں لالچ کیسا تم نہیں چور تو دزدیدہ نگاہی کیسی
پارسا جان کے وہ مجھ سے ملے دھوکے میں آگئی کام مری پاک نگاہی کیسی
کیا بری چیز ہے الفت کا برا ہوئے داغ
دل سے ہمدم نے برائی مری چاہی کیسی

تری محفل میں یہ کثرت کبھی تھی ہمارے رنگ کی صحبت کبھی تھی
ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا تری صورت تری صورت کبھی تھی
دکن میں آئے ہم ہندوستاں سے تصور میں بھی یہ صورت کبھی تھی
جہاں سو حسرتوں کی لوٹ ہے اب یہیں اک شخص کی تربت کبھی تھی
تم اترائے کہ بس مرنے لگا داغ
بناوٹ تھی جو وہ حالت کبھی تھی

غیر سے میری طرف داری ہے یہ نئی طرح کی عیاری ہے
کم نہیں موت سے دل کا آنا سخت مجبوری و ناچاری ہے
اتنی ہی رات ہے جتنی سمجھو یہی آدمی ہے یہی بیماری ہے
یہ رہے جان رہے یا نہ رہے وضع داری بڑی بیماری ہے
داغ دشمن سے بھی جھک کر ملیے
کچھ عجب چیز ملنساری ہے

کبھی ہم سے نہ کہنا تیرا کہنا ہم نہ مانیں گے جو ضد آئی تو بے منوائے اصلا ہم نہ مانیں گے

گواہی کون دے میرا ثبوتِ عشق کیونکر ہو
وہ کہتے ہیں قیامت تک تیرے دعوے ہم نہ مانیں گے

بہت ہمدرد و یک جان و دو قالب ہم نے دیکھے ہیں
نہیں ہے کوئی دنیا میں کسی کا ہم نہ مانیں گے

وہ کہتے ہیں ہم آہ و اشک سوزاں کے نہیں قائل
بہم ہوں آب و آتش دونوں یکجا ہم نہ مانیں گے

تمہیں خطِ غلامی داغ لکھ دے کیا سند اس کی
کہ ایسا شخص ہو بندہ کسی کا ہم نہ مانیں گے

تو وہ ہے سب بت کافر ترے قربان گئے
جو خدا کو کبھی نہ مانیں وہ تجھے مان گئے

دعویٔ مہر و وفا پر وہ برا مان گئے
الٹے نادم ہوئے احسان کے احسان گئے

یاالٰہی کہیں لٹتی تو نہیں راہِ عدم
جانے والے جو یہاں چھوڑ کے سامان گئے

آج کل نالۂ بلبل میں کبھی تاثیر نہیں
کیا عجب گل یہ بکا لے کے مرے کان گئے

بندۂ عشق ہوا ایسے کہ الٰہی توبہ
نہ تو معشوق کو اے داغ خدا جان گئے

عشق میں دنیا میں دعائیں دم رحلت کیسی
مجھ سے مل مل کے گلے رنج ہے حسرت کیسی

سحر و سفاکی و بیباکی و شوخی و عتاب
جس کی آنکھوں میں یہ فتنے ہوں مروت کیسی

اب تو وہ دیدار ہی نالوں کا رہا تھا جھگڑا
ہار دی حضرتِ دل آپ نے ہمت کیسی

کوئی دنیا میں نہیں تیری طرح ہرجائی
اے اجل تجھ کو بھی ہے گردشِ قسمت کیسی

نظر آتا ہے پری رو جو کوئی شوخ و شریر
گدگداتی ہے بھرا اے داغ طبیعت کیسی

بچا نا آفتِ تیرِ نظر سے
الٰہی یہ بلا آئی کدھر سے

نہ روکا شامِ فرقت کو کسی نے
دہائی دے رہا تھا میں سحر سے

کیا ہے ضبط جب دردِ محبت — گرے ہیں ٹپ ٹپ آنسو چشمِ تر سے
ملی سوز و گدازِ ہجر کی داد — بہے آنسو مرے شمعِ سحر سے
رقیبِ روسیہ کیوں سر چڑھا ہے
اُسے صدقے کرو تم داغؔ پر سے

لو دو ہی دن کے بعد یہ اُن کا خیال ہے — چھوڑو بھی رسم و راہ کہاں کا وبال ہے
میں کیا کہوں کہ جو مجھے شوقِ وصال ہے — تم دیکھ لو فقیر کی صورت سوال ہے
لیل و نہار اپنے گزرتے ہیں ایک شکل — جو شب کو خواب تھا وہی دن کو خیال ہے
جینا ہے ننگِ عشق تو مرنا خلافِ عقل — یہ بھی محال ہے مجھے وہ بھی محال ہے
اے داغؔ ان کی رنجشِ بے جا کا کیا علاج
اپنے قصور پر بھی تو مجھ سے ملال ہے

کام رکنے کا نہیں اے دلِ ناداں کوئی — خود بہ خود غیب سے ہو جائے گا ساماں کوئی
پر ہیں امیدِ شہادت میں جیے ہم اے خضر — تیغ سے بڑھ کے نہیں دم کا نگہباں کوئی
نظر آتا نہیں محفل میں کہیں پروانہ — بن کے بیٹھا ہے کہاں شمعِ شبستاں کوئی
ان ابھٹتی ہوئی باتوں کے نہیں ہم قائل — کرے انکار یہ اندازۂ پیماں کوئی
مٹ چکی ہے خلشِ دل مگر اب بھی اے داغؔ
پھانس کی طرح کھٹک جاتا ہے ارماں کوئی

شکستِ عہد سے ہوتا ہی کیا ہے — انھیں اس بات کی پروا ہی کیا ہے
سمجھتا ہی نہیں قاصد مری بات — زبانِ نامہ بر پر کیا ہی کیا ہے
رہی کیوں اس دلِ ویراں میں حسرت — نہ ہو وحشت تو وہ صحرا ہی کیا ہے

ادا ہے ابتدا مشقِ جفا کی — بہت ہوگا ستم اتنا ہی کیا ہے
اگر سن لیں وہ حالِ زار اے داغ — ترے کہنے کا پھر کہنا ہی کیا ہے

دل جگر سب آبلوں سے بھر چلے — مر چلے اے سوزِ فرقت مر چلے
کربلا ہے کوئے قاتل کی زمیں — شام کو پہنچے وہیں دن بھر چلے
مار ڈالے گی قفس میں بوئے گل — ہم اسیروں سے ہوا بچ کر چلے
منزلِ مقصود کے خواہاں ہیں سب — ساتھ کس کس کو کوئی لے کر چلے
داغ کے لب پر ہے مصرع درد کا — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ابروئے یار کیوں نہ کھچے اس مثال سے — اس کے تو ناخنوں میں پڑے ہیں ہلال سے
کیا شکوۂ فراق کروں اس کی فکر ہے — بے لطفیاں بڑھیں گی ترے انفعال سے
احسان مانتا ہوں ترا اے دلِ حزیں — وہ شاد شاد ہیں مرے حزن و ملال سے
ہوتا ہے خشک دامنِ تر کیا طلسم ہے — طوفانِ گریہ و عرقِ انفعال سے
اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ — ملتے امیر احمد و سید جلال سے

دیے ہیں ہجر میں دکھ درد کس بلا کے مجھے — شبِ فراق نے مارا لٹا لٹ کے مجھے
ہجومِ ناز میں گھر کر دہائی دی دل نے — یہ لوٹے لیتے ہیں تنہا غریب پا کے مجھے
مکدرِ اہلِ فلک میری مشتِ خاک سے ہیں — بگاڑ ڈال دیا آدمی بنا کے مجھے
بلائے عشق تو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو — مرا رقیب بھی رویا گلے لگا کے مجھے
غضب ہے آہ مری، داغ نام ہے میرا
تمام شہر جلاؤ گے کیا جلا کے مجھے

یادگارِ داغ

نومبر ۱۹۰۵ء

صبر و قرار و ہوش گئے دل بھی کھو گیا
جو کچھ مرے نصیب کا ہونا تھا ہو گیا

کم بخت یہ بھی دے نہ سکا رات بھر کا ساتھ
میں جاگتا رہا شبِ غم بخت سو گیا

اتنا گناہگار ہے افشائے عشق میں
آنسو نکل کے دامنِ مژگاں بھگو گیا

دل کو محیطِ عشق سے چاہا نکالنا
ہم کو بھی ساتھ ڈوبنے والا ڈبو گیا

اے داغ عشق آفتِ جاں ہے ذرا سنبھل
دو دن میں کیا سے کیا یہ ترا حال ہو گیا

کیوں پھر گئی، تجھے نگہِ یار کیا ہوا
مجھ پر اگر ہوا بھی تو اک وار کیا ہوا

ہم بیچتے تھے دل کو جس انداز کے لیے
کیا جانیے وہ نازِ خریدار کیا ہوا

وہ ساتھ غیر کے مرے ہمسائے میں رہے
اے آسماں بتا پسِ دیوار کیا ہوا

اے انقلابِ دہر وہ جلسے کہاں گئے
وہ بزمِ عیش اور وہ دربار کیا ہوا

اس کے ہی دم کے ساتھ یہ ناز و نیاز ہے
پھر یہ کہو گے داغِ وفادار کیا ہوا

وہ جلوہ تو ایسا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا آنکھوں کو مگر دید کا لپکا نہیں جاتا
کیا خاک کروں اُن سے تغافل کی شکایت یہ حال ہی ایسا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا
کہتا ہوں تو رُکتی ہے زباں سامنے اس کے لکھتا ہوں اگر حال تو لکھا نہیں جاتا
میں وضع کا پابند ہوں گو جان بھی جائے جب کوئی بلاتے نہیں آتا، نہیں جاتا

وہ کہتے ہیں کیا جور اُٹھاؤ گے تم اے داغ
تم سے تو مرا ناز اُٹھایا نہیں جاتا

حال دل کا آشکارا ہو گیا یہ ہمارا تھا تمہارا ہو گیا
اشک پی کر رنج کھا کر ہجر میں ہو گیا جوں توں گزارا ہو گیا
گرچہ وہ جھوٹی تسلّی دے گئے مجھ کو جینے کا سہارا ہو گیا
آئے کیا دنیا میں ہم کیا سیر کی چلتے پھرتے اِک نظارا ہو گیا

داغ اترائے ہوئے پھرتے ہو تم
کیا ملاپ اُن کا تمہارا ہو گیا

کون دنیا میں باوفا نکلا یہ تمہاری زباں سے کیا نکلا
بت کدہ دیکھ کر ہوئی عبرت میرے منہ سے خدا خدا نکلا
اب دماغ اُن کا آسماں پر ہے کیوں مرے منہ سے مدّعا نکلا
میں نے چھوڑا انہیں نہ جب تو کہا یہ تو ظالم بُری بلا نکلا

داغ کو لوگ رند کہتے ہیں
وہ حقیقت میں پارسا نکلا

کٹ گیا ماہِ صیام اچھی طرح کیجیے شُربِ مدام اچھی طرح

موت کیوں کر آ گئی روزِ فراق	کر لیا تھا انتظام اچھی طرح
داغِ دل بھی ہے عجب روشن چراغ	جل رہا ہے صبح و شام اچھی طرح
دل بہت کرنے پڑیں گے پائمال	کیجیے مشقِ خرام اچھی طرح

داغ کیا مُہرِ دہانِ تنگ ہے
کیوں نہیں لیتے وہ نام اچھی طرح

پھرتے بیٹھے ہیں وہاں غیروں کے اندر باہر	روز ہم پھر کے چلے آتے ہیں باہر باہر
بھر گیا اُن کا مکاں روز کی تحریروں سے	لے پڑھے پھینک دیا شوق کا دفتر باہر
جلوہ بے تاب جو ہوتا ہے تو کب چھپتا ہے	بجلیاں کوندتی ہیں پردے کے اندر باہر
دیکھتے ہی مجھے محفل میں انہیں تاب کہاں	خود کھڑے ہو گئے یہ کہتے ہوئے باہر باہر

دل لگی ہو تو کہیں داغ کا دل بھی بہلے
اس کو یکساں ہے جدائی میں تری گھر باہر

وہ ہوئے مہربان دشمن پر	پھٹ پڑے آسمان دشمن پر
جان اس بے وفا کو ہم نے دی	جس کی جاتی ہے جان دشمن پر
لوگ کہتے ہیں کیا، سنو تو سہی	جھک پڑا اک جہان دشمن پر
اب برسنے لگے وہ ہم پر بھی	کھل گئی ہے زبان دشمن پر

داغ تم دل کو دوست سمجھے ہو
دوستی کا گمان دشمن پر

گل چیں کے ہاتھ آئے عروسِ چمن کے پھول	یارب کسے نصیب ہوئے اس دلہن کے پھول
تلوے فگار دیکھ کے کانٹوں سے بارہا	غربت میں یاد آئے ہیں باغِ وطن کے پھول

میرے سرشکِ خوں کی نہ کیوں کر بہار ہو — یہ دل کی لاگ کے ہیں یہ دل کی لگی کے پھول
وہ رندِ پاک مشرب و صافی نہاد ہوں — آتی ہے دُردِ بھی مرے ساغر میں بن کے پھول

اے داغ روشنی ہے خداداد طبع میں
بجھتے نہیں ہیں میرے چراغِ سخن کے پھول

لب پہ دشنام تو وہ دل سے دعا دیتے ہیں — گھول کر زہر مجھے آبِ بقا دیتے ہیں
ایسے پامالوں کے مرمٹنے پہ رشک آتا ہے — جن کو مٹی ترے نقشِ کفِ پا دیتے ہیں
لے چلے مجھ کو وہ یہ کہہ کے سوئے گورستاں — چل تجھے آج ٹھکانے سے لگا دیتے ہیں
آ کے بازارِ محبت میں ذرا سیر کرو — لوگ کیا کرتے ہیں کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

کعبے والوں نے تو اے داغ دیا صاف جواب
اہلِ بت خانہ ہمیں دیکھیے کیا دیتے ہیں

وہ دور بھی ہیں جب بھی تصور میں قریں ہیں — ہم بے خود و وارفتہ جو ہیں بھی تو نہیں ہیں
آئے بھی ہیں بیٹھے بھی ہیں جاتے بھی نہیں ہیں — مجھ پر یہ کرم ان کے دمِ بازپسیں ہیں
پہلے تو سمجھتا ہوں کہ ہیں درپئے آزار — پھر دل میں یہ آتا ہے وہ ایسے تو نہیں ہیں
اے بے خودیِ شوق ہماری ہے یہ ہستی — دنیا میں ہیں اس طرح کہ دنیا میں نہیں ہیں

تکلیف محبت کی چھپائے نہیں چھپتی
صدمے ترے دل پر بہت اے داغِ حزیں ہیں

موت زندہ چھوڑنے والی نہیں — اس بلا سے کوئی گھر خالی نہیں
بات تیری پیچ سے خالی نہیں — عمر بھر ہم نے مگر ٹالی نہیں
تم ستا کر اس کو خوش ہوتے رہے — کیا یہ عاشق کی خوش اقبالی نہیں

کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو　　خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں
تم نے جادوگر اُسے کیوں کہہ دیا
دہلوی ہے داغؔ بنگالی نہیں

عجب عشق دونوں کے پیارے ہوئے ہیں　　کہ شہرے ہمارے تمہارے ہوئے ہیں
کہاں کے رہے وہ محبت میں یا رب　　سہارے سے جو بے سہارے ہوئے ہیں
خبر ہے ہمیں جس سے محفل میں شب کو　　نگاہیں لڑی ہیں اشارے ہوئے ہیں
بگاڑے بگڑتے نہیں حسن والے　　یہ بندے خدا کے سنوارے ہوئے ہیں
کہا داغؔ سے آنکھ اُس نے ملا کر
اجی آپ عاشق ہمارے ہوئے ہیں

طبیعت کو عاشق کہیں رو کتے ہیں　　مگر کیا کروں ہم نشین روکتے ہیں
بساؤ نہ غیروں کو یہ فتنہ رفتہ　　تمہاری گلی کی زمیں روکتے ہیں
ترا گھر رقیبوں کا گھر ہو گیا ہے　　انہیں تیرے درباں نہیں روکتے ہیں
جو آنسو نہ رکتے تو آتا ہی طوفاں　　یہ ندی یہ نالے ہمیں روکتے ہیں
تمہیں داغؔ غیروں سے کیوں ملنے دیتا
بری بات سے کیا نہیں روکتے ہیں

غیر کے ساتھ مرے قتل کا ساماں کیوں ہو　　جو اُٹھائے نہ اُٹھے مجھ سے وہ احساں کیوں ہو
تجھ سے بے درد امرے درد کا درماں کیوں ہو　　چاہنے والے کی مشکل کبھی آساں کیوں ہو
کچھ تو ہے بات کسی کی تو ہے آمد آمد　　ورنہ یوں گھر میں ترے عید کا ساماں کیوں ہو
اُکھڑی اُکھڑی یہ لگاوٹ ہی ستم کرتی ہے　　یاس کیوں ہو کسی کم بخت کو ارماں کیوں ہو

داغ کو تم سے مری جان یہ اُمید نہ تھی — جھوٹے منہ بھی تو نہ پوچھا کہ پریشاں کیوں ہو

اپنے دل کا مکان اور ہی ہے — اس میں اک میہمان اور ہی ہے
گر چہ ہے وہ کریم بندہ نواز — بے نیازی کی شان اور ہی ہے
یاد سے تیری نرگس سے تیرے — اور ہے دل زبان اور ہی ہے
تو مٹائے گی اے قیامت کیا — مرمٹوں کا نشان اور ہی ہے

اے فلک تیری مہربانی کیا
داغ کا مہربان اور ہی ہے

لاگ اے چارہ گر نہ ہو جائے — تیرے سر دردِ سر نہ ہو جائے
مرگِ دشمن کی کیا دعا مانگوں — کہیں الٹا اثر نہ ہو جائے
ہے پسِ مرگ مجھ کو خوفِ عذاب — قبر دشمن کا گھر نہ ہو جائے
اس کو تعلیمِ ناز خوب نہیں — بے خبر با خبر نہ ہو جائے

کیوں جگہ دیں وہ اپنے پہلو میں
داغ داغِ جگر نہ ہو جائے

یہ پیشتر زمیں سے ہے یا آسماں سے ہے — کیا جانے ابتدائے محبت کہاں سے ہے
قربان جاؤں صبرِ دلِ بے قرار کے — پیغام جو یہاں سے نہ تھا وہ وہاں سے ہے
کیا لطفِ زندگی ہے کہ اس زندگی کا لطف — آگے بڑھا ہوا مری عمرِ رواں سے ہے
جاتا ہے کون کوئی وہاں جا کے کیا کرے — اک چھیڑ ہم کو مدِ نظر پاسباں سے ہے

پیری میں داغ جوششِ مضامیں ہے رنگ پر
اس باغ کی بہار ہماری خزاں سے ہے

نکالوں کس طرح خارِ تمنّا سخت مشکل ہے
وہ اس ڈر سے نہیں چھوتے کہ یہ کانٹوں بھرا دل ہے
جب ان کا امتحاں کیجے تو مٹھی میں نیا دل ہے
الہٰی کیا حسینوں کو بھی دستِ غیب حاصل ہے
گریزاں ہے مقامِ امن سائے سے مرے کوسوں
کہ پیچھے پیچھے میں ہوں میرے آگے آگے منزل ہے
بڑھا رہتا ہے کیا کیا طالبِ دیدار ہو ہو کر
مرے پائے نگہ پر بھی گمانِ دستِ سائل ہے
نہ گھبرا عقدۂ دشوار سے اے داغ تو ہرگز
قسم مشکل کشا کی یہ کوئی مشکل میں مشکل ہے

اک وار جگر پر نگہِ یار سے ہو جائے
تلوار کا جو کام ہے تلوار سے ہو جائے
پھر کون سی امید رہی لطف و کرم کی
جب فیصلہ ہی آپ کے انکار سے ہو جائے
یہ پاؤں جلیں میں جو قدم طور پہ رکھوں
نظارہ جو اس روزنِ دیوار سے ہو جائے
پھر دیکھے کوئی آئنۂ دل کی صفائی
یہ صاف جو عکسِ رخِ دلدار سے ہو جائے
اے داغ اسے لطف و عنایت کا مزا کیا
جس دل کو محبت ستمِ یار سے ہو جائے

دھمکی ہمارے واسطے روزِ جزا کی ہے
کوئی نہ کوئی اس میں بھی حکمت خدا کی ہے
جب تک ہے دم میں دم یہ نباہیں گے ہر طرح
مٹی خراب عشق میں اہلِ وفا کی ہے
شوخی سمائی جاتی ہے عہدِ شباب میں
دشوار روک تھام اب ان کو حیا کی ہے
ظاہر میں اور رنگ ہے باطن میں اور رنگ
خصلت مزاجِ یار میں رنگِ حنا کی ہے

اے داغ بزمِ اہلِ سخن گرم ہو گئی　　گرمی ترے کلام میں کتنی انتہا کی ہے

مزے فرقت میں تھے خونِ جگر کے　　پیا ہم نے خدا کا شکر کر کے
جمی ہے خاکِ کوئے یار اُن پر　　یہ یوں گا پاؤں دھو کر نامہ بر کے
شبِ غم ہائے ... ہوری ہماری　　بہت روئے خدا کو یاد کر کے
پڑا ہو گا تھکا ماندا سرِ راہ　　بنیں گے نامہ بر ہم نامہ بر کے
جنابِ داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک
کہ یہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

بے قراری دمِ تحریر چھپے مشکل ہے　　میرے خط میں خطِ مسطر بھی رگِ بسمل ہے
اُس نے بازارِ محبت میں جو رکھا ہے قدم　　یہی آواز چلی آئی ہے دل ہے دل ہے
دھوکے دیتی ہیں سرِ بزم نگاہیں کیا کیا　　کس طرف تیری توجہ ہے کدھر مائل ہے
وادیِ عشق میں رکھتا ہوں قدم ڈر ڈر کر　　راہ زن کا وہیں کھٹکا ہے جہاں منزل ہے
حضرتِ داغ کا اقبال بہت چمکے گا
ہم دکھا دیں گے اگر فضلِ خدا شامل ہے

وہ کیا ڈرے غریب کی فریاد و آہ سے　　جو چاہتا ہو دادِ ستم داد خواہ سے
پہلو میں میرے دیکھ جگر بھی ہے دل کے ساتھ　　ہاں ایک وار اور بھی تیغ نگاہ سے
آنکھیں دکھا رہا ہے ہر اک نقشِ پا مجھے　　کیا اس طرف تم آئے ہو دشمن کی راہ سے
باہم رہا یہ رشک کہ اُس بزمِ ناز میں　　ہم اور راہ سے گئے دل اور راہ سے
دیکھو یہ ضبطِ سوزِ محبت بُرا ہے داغ
تم جل نہ جاؤ آپ کہیں اپنی آہ سے

ازل میں شرح لکھ کر میرے غم کی
بُری حالت ہوئی لوح و قلم کی

شبِ وعدہ رہا یہ شغل اپنا
گئی گنتی ترے قول و قسم کی

ترے کوچے سے روتا کون گزرا
کہ مٹی جم گئی نقشِ قدم کی

تمنائے دلی کی انتہا کیا
بہت کچھ آرزو کی پھر بھی کم کی

جنابِ داغ پھر عاشق ہوئے ہیں
منائیں خیر حضرت اپنے دم کی

اِستدراک

(انتخاب از ضمیمۂ یادگارِ داؔغ)

اس سے پہلے جو انتخابِ غزلیاتِ داؔغ درج کیا گیا ہے وہ داؔغ کے چار دیوانوں (گلزارِ داؔغ، آفتابِ داؔغ، مہتابِ داؔغ اور یادگارِ داؔغ) میں سے ہے۔ اس وقت تک ضمیمۂ یادگارِ داؔغ مجھے دستیاب نہیں ہوا تھا۔ اب مل گیا ہے۔ لہٰذا اس دیوان کا بھی کچھ احوال اور انتخاب نذرِ احباب کیا جاتا ہے۔

مطالعۂ داؔغ[1] میں لکھا ہے کہ ضمیمہ یادگارِ داؔغ "غالباً ۱۳۲۷ھ یا ۱۳۲۸ھ [۴ جنوری ۱۹۰۹ء تا ۲ جنوری ۱۹۱۱ء] میں طبع ہوا"۔ تمکینؔ کاظمی[2] مرحوم لکھتے ہیں[3]:

"لالہ سری[4] رام ایم اے مؤلف تذکرہ خمخانۂ جاوید جب حیدرآباد تشریف لائے

---

[1] ص ۱۰۸ مؤلفہ ڈاکٹر سیّد محمد علی زیدی

[2] ولادت ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء وفات ۲۷ مئی ۱۹۶۱ء

[3] "نواب مرزا خاں داؔغ" از تمکینؔ کاظمی، لاہور ۱۹۶۰ء۔ ص ۲۰۸

[4] ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء تا ۲۵ مارچ ۱۹۲۶ء

تو انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انہوں نے مہتابِ داغ۔۔۔۔ بڑے
ہی نفیس کاغذ پر عمدہ چھپوا دیا ہے اور پھر یادگارِ داغ بھی انہوں نے
شائع کیا ہے۔ اس کے بعد جو غزلیں ملیں انہیں "ضمیمۂ یادگارِ داغ" کے
نام سے چھپوا دیا ہے ———————————— "

خمخانۂ جاوید کی جلد سوم ۱۹۱۷ء میں چھپی تھی۔ اس میں داغ کے ترجمے (ص ۱۱۴) میں لالہ سری رام لکھتے ہیں:

"مہتابِ داغ حیدر آباد کے قیام کا نتیجہ ہے اور وہیں پہلی مرتبہ (تکمیلِ
کتابت ۲۳ دسمبر ۱۹۰۳ء تا چھپا۔ اب دوسری بار راقم تذکرہ نے۔۔۔۔
۔۔۔ بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ یادگارِ داغ نامی چوتھا دیوان[1] سید علی احسن
نے۔۔۔۔۔۔۔ لاہور سے شائع کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ راقم تذکرہ نے
۔۔۔۔۔۔۔ بقیہ غیر مطبوعہ کلام بطور ضمیمہ یادگارِ داغ مرتب کر کے
شائع کیا ———————————— "

مہتابِ سخن کا دوسرا ایڈیشن مرتبہ لالہ سری رام میرے کتب خانے میں ہے۔ اس کے سرورق سے اور خمخانۂ جاوید جلد سوم (مطبوعہ ۱۹۱۷ء) کے ٹائٹل کے آخری صفحے سے کچھ اور ہی کھلتا ہے۔ اس آخری صفحے پر لالہ سری رام کی مرتبہ کتابوں کی فہرست ہے۔ اُن میں مہتابِ سخن اور ضمیمہ یادگارِ داغ دونوں شامل ہیں۔ فہرست سے معلوم ہوا کہ ضمیمہ یادگارِ داغ کی قیمت آٹھ آنے مقرر تھی۔ دیوان مہتابِ داغ دو قسموں میں شائع

---

[1] نومبر ۱۹۰۵ء میں اسٹیم پریس لاہور میں چھپا تھا۔ تمکین کاظمی کا بیان بحوالہ لالہ سری رام کہ "انہوں نے مہتابِ داغ۔۔۔۔۔۔۔ چھپوا دیا ہے اور پھر یادگارِ داغ۔۔۔
۔۔۔ شائع کیا" درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کیونکہ مہتابِ داغ لالہ سری رام ایڈیشن
۔۔ داغ سے برسوں بعد چھپا تھا۔

کیا گیا تھا۔ قسم اوّل کی قیمت تین روپے تھی (کیونکہ اس کے ساتھ ضمیمۂ یادگارِ داغ بھی مجلّد تھا) اور دوسری قسم کی قیمت دو روپے آٹھ آنے تھی کیونکہ وہ بلا ضمیمہ تھا۔ میرے کتب خانے میں جو مہتابِ داغ مرتبہ لالہ سری رام ہے۔ اس کے سرورق پر

مہتابِ داغ

مع

ضمیمہ یادگارِ داغ

تحریر ہے مگر دیوان کے آخر میں ضمیمہ شامل نہیں۔ تاہم سرورق کی تحریر سے ظاہر ہے کہ "مہتابِ داغ مع ضمیمۂ یادگارِ داغ بھی شائع کیا گیا تھا اور بلا ضمیمہ بھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مہتابِ داغ اور ضمیمۂ یادگارِ داغ ایک ہی ساتھ اکٹھے اور الگ الگ شائع ہوئے تھے۔ مہتابِ داغ کا صرف سرورق "مطبع مفیدِ عام لاہور میں طبع ہوا۔" باقی کتاب بجز سرورق باہتمام بابو پیارے لال بھارگو در نولکشور پریس لاہور طبع" ہوئی ـــ مگر ضمیمۂ یادگارِ داغ پورا کا پورا "مطبع مفیدِ عام لاہور میں طبع ہوا۔ تعداد جلد ۱۲۰۰"۔ قیاس ہے کہ دونوں دیوان خمخانۂ جاوید جلد سوم مطبوعہ ۱۹۱۷ء سے پانچ چھ سال پہلے طبع ہوئے ہوں گے یعنی ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں کیونکہ خمخانۂ جاوید سوم کی (شاید تکمیلِ کتابت کی) ایک تاریخ ۱۳۳۰ھ بھی ہے جو مطابق ہے ۱۹۱۲ء کے۔

ضمیمۂ یادگارِ داغ کے (سرورق کو چھوڑ کر) کل صفحات ۴۶ ہیں۔ ان میں ۶۷ مکمل (بعض خاصی طویل) غزلیں ہیں۔ جن کے کل اشعار ۱۱۳۶ ہیں۔ ان کے علاوہ ۲۸ متفرق اشعار ہیں جن میں ۴ شعر مطلع اور مقطع کے بغیر ایک ہی غزل کے اور ۹ شعر مطلع کے بغیر مگر مقطع کے ساتھ ایک ہی غزل کے ہیں۔ محض دلچسپی کے لیے، اگر مقطع کو داغ کی غزلیہ شاعری کا آخری شعر (غزل کا آخری مطبوعہ شعر تو وہ ہے ہی) قیاس کر لیا جائے تو وہ یہی ہوگا ؎

داغ رہتا ہے اسی فکر میں غمگین و حزیں
مجھ کو کیا بات بجز رنج نہیں آتی ہے

دیوان کے آخر میں ایک قطعہ درج ہے جو حقیقت میں رُباعی ہے اور اب سب جب تین قافیوں پر مبنی ہے۔ باقی پورا کا پورا مصرع ردیف ہے ؎

اب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے
سب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے
پہلے یہ کہو کہ "میں نہ مانوں گا بُرا"
جب تم سے کہوں جو کچھ ہے دل میں میرے

"انتخابِ ضمیمۂ یادگارِ داغ"

دل اُس کے گیسوئے پُر پیچ و تاب سے چھوٹا
بہشت میں کبھی نہ میں اس عذاب سے چھوٹا

اُنہوں نے غور سے دیکھا جو میرے دیواں کو
نہ کوئی شعر مرا انتخاب سے چھوٹا

مرے حساب سے دن زندگی کے تھوڑے ہیں
حساب کر کے غم بے حساب سے چھوٹا

قرارِ دل کو نہ آیا تو مجھ کو موت آئی
چھٹا وہ صبر سے میں اضطراب سے چھوٹا

بیان اُن کے ہوں اوصاف داغؔ سے کیا کیا
کوئی نہ وصفِ شہِ بوتراب سے چھوٹا

حال دل کا آشکارا ہو گیا
یہ ہمارا تھا تمہارا ہو گیا

مل گئی کوچے میں اُس کے کچھ جگہ
بیٹھ رہنے کا سہارا ہو گیا

آئے کیا دنیا میں ہم کیا سیر کی
چلتے پھرتے اِک نظارا ہو گیا

منتظر تھے اِک نگاہِ مست کے
پھر کہاں ہم جب اشارا ہو گیا

داؔغ اترائے ہوئے پھرتے ہو تم
کیا ملاپ اُن کا تمہارا ہو گیا

خرید کر دلِ عاشق کو یار لیتا جا
نہ ہوں جو دام گرہ میں اُدھار لیتا جا
نکل کے جلد نہ جا اس قدر توقف کر
دعائے خیر دلِ بے قرار لیتا جا
مزے وصال کے اے دل خیالِ یار میں ہیں
خوشی کے ساتھ شبِ انتظار لیتا جا
ہوا کے جھونکے سے کہتا ہوں میں جب آتا ہے
کسی کے دل سے اُڑا کر غبار لیتا جا
مزہ جبھی ہے کہ بھر بھر کے داؔغ جامِ شراب
وہ دیتے جائیں تو اے بادہ خوار لیتا جا

نہ کیا تم نے امتحانِ رقیب
ورنہ بچتی کبھی نہ جانِ رقیب
اُس کی تعریف نے کیا بدظن
دوست پر ہے مجھے گمانِ رقیب
جھوٹ کیوں بولتا ہے تو مجھ سے
کیا ترے مُنہ میں ہے زبانِ رقیب
تم بلاؤ۔ وہ آئے۔ کیوں آئے؟
اس میں ہوتی ہے کسرِ شانِ رقیب
داؔغ اس نام سے وہ ہیں مشہور
اُن کو کہتے ہیں مہربانِ رقیب

بے اثر ٹھہریں دعائیں سب کی سب
عمر بھر کی وہ وفائیں سب کی سب
وہ نہ جائے ہجر میں کوئی بلا
کس نے روکا اُن کو آئیں سب کی سب
کیا کروں میں اُن کی یہ تاکید ہے
تو اُٹھا میری جفائیں سب کی سب
جلئے حوروں میں اگر تیرا شہید
اپنی آنکھوں پر بٹھائیں سب کی سب
داؔغ کو ہے اُس کی رحمت سے اُمید
بخش دے گا وہ خطائیں سب کی سب

اُٹھے ہیں بزمِ یار سے ہم کہہ کے یا نصیب! آئندہ دیکھنا ہے دکھاتا ہے کیا نصیب

قسمت سے غیر کی مری تقدیر کیا ملے اُس کا جُدا نصیب ہے میرا جُدا نصیب

کیوں صبر آئے گا دلِ بے تاب کو مرے کیوں تیری چشمِ شوق کو ہو گی حیا نصیب

بوتل کھلی ہوئی ہے جو قاضی کے سامنے ہم جانتے ہیں دخترِ رز کا کھلا نصیب

وہ آج بزمِ غیر میں یہ صاف کہہ اُٹھے

ملتا بھی ہے کسی کو کہیں داغ سا نصیب

مانوں گا میں نہ تجھ کو ستمگر کہے بغیر محشر میں چین آئے گا کیونکر کہے بغیر

بھولے ہو تم نہ سمجھو گے بات ایک بار کی مجھ کو نہ بن پڑے گی مکرر کہے بغیر

مجھ کو مزا ہے چھیڑ کا دل مانتا نہیں گالی سُنے بغیر ستمگر کہے بغیر

روزِ جزا چھپاؤں محبت کا راز کیا سب جانتا ہے داورِ محشر کہے بغیر

جو ہیں اشارہ فہم سمجھتے ہیں بن کہے

نکلا ہے کام داغ کا اکثر کہے بغیر

محوِ قدِ یار ہو گئے ہم سولی پہ چڑھے تو سو گئے ہم

کافر کہیں ہم کو یا مسلماں اب ہو گئے جس کے ہو گئے ہم

دنیا ہی میں کیوں یہ فردِ اعمال اشکوں سے نہ اپنے دھو گئے ہم

تھی عشق کی آبرو ہمیں سے وہ بعد فنا ڈبو گئے ہم

کل آئے جو وہ کہیں سے اے داغ

آج اُن کے سلام کو گئے ہم

زاہد خدا ملے گا نہ تجھ کو یہاں کہیں کون و مکاں کہیں ہے تو ہے لامکاں کہیں

بیداد کم رہا ہے وہ عہدِ شباب میں
اے آسمانِ پیر ہو تو بھی جواں کہیں

میں غیر کی نگاہ میں تم میرے دل میں ہو
میرا مکاں کہیں ہے تمہارا مکاں کہیں

ٹھکرا کے اس نے قبر کو ہشیار کر دیا
مجھ کو خبر نہ تھی کہ مرا ہے نشاں کہیں

تم نام پر رقیب کے بگڑے ہو داغ سے
باتیں جو بھید کی تھیں وہ اس نے کہاں کہیں

بہت ہی مختصر تھا وصل کا دن
خدا جانے کب آیا کب گیا دن

عیادت کو مریضِ غم کی آپ آئے
اُسے گزرے ہوئے ہے تیسرا دن

کرے کس وقت کوئی عرضِ مطلب
وہاں ہے رات دن کی رات کا دن

وہی دن ہے مبارک جب ملیں وہ
نہیں ہم جانتے اچھا بُرا دن

ترے گھر داغ ہو ہر روز نوروز
دکھائے تجھ کو بھی ایسے خدا دن

تم لاکھ مجھ سے پردہ کرو جلوہ گاہ میں
صورت یہ کہہ رہی ہے کہ میں ہوں نگاہوں میں

آمیزشِ ثواب ہے میرے گناہ میں
دل بت کدے میں اور قدم خانقاہ میں

وہ تجھ سے مل کے حشر میں پوری نہ ہو کہیں
تھوڑی سی ہے کمی جو ہمارے گناہ میں

اک دوستی کی، ایک نظر دشمنی کی ہے
تم بھی نگاہ میں ہو عدو بھی نگاہ میں

جاتا ہے داغ کعبہ کو بت خانہ چھوڑ کر
ٹھوکر ضرور کھائے گا پتھر سے راہ میں

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

اب تو بیمارِ محبت تیرے
قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں

اہلِ کلکتہ سے لائق فائق　　اہلِ لاہور ہوئے جاتے ہیں
گھڑیوں بڑھتا ہے حسینوں کا جمال　　اور سے اور ہوئے جاتے ہیں
کچھ خبر بھی ہے محبت میں داغ
کیا ترے طور ہوئے جاتے ہیں

یہ سنتے ہیں اُن سے یہاں آنے والے　　جہنم میں جائیں وہاں جانے والے
وہ جاگے سحر کو تو لڑتے ہیں مجھ سے　　کہ تھے کون تم خواب میں آنے والے
جو واعظ کے کہنے سے بھی توبہ کرلوں　　نہ کوسیں گے کیا مجھ کو مے خانے والے
برستا نہیں مینہ الٰہی کہاں تک　　پئیں خون کے گھونٹ مے خانے والے
سلامی ہیں اے داغ اس کے ہی در کے
نہ ہم کعبے والے نہ بُت خانے والے

ہلایا جب مری آہ و فغاں نے　　زمیں پکڑی ہے کیا کیا آسماں نے
وہ یہ سمجھے سبھی عاشق ہیں سچے　　بچایا سب کو میرے امتحاں نے
وہ جب تربت پہ آئے میں نہ اُٹھا　　سُبک مجھ کو کیا خوابِ گراں نے
رہی جن سے بہارِ باغِ عالم　　اُنہیں پھولوں کو توڑا باغباں نے
حقیقت میں تو اس قابل نہ تھا داغ
بہت کی قدر شاہِ قدرداں نے

فتنہ گر آنکھ تھی وہ زلف دوتا اور ہوئی　　یہ وبالِ دل وجاں ایک بلا اور ہوئی
چارہ گر سے مجھے تکلیف سوا اور ہوئی　　دل کو تھا اور مرض اس کی دوا اور ہوئی
آدمی کے لیے جنت بھی نہ دوزخ ہوجائے　　راس کب آئی اگر آب و ہوا اور ہوئی

عاشقوں کا بھی وہ انداز طبیعت نہ رہا　　پہلے کچھ اَور تھی اب رسم وفا اَور ہوئی
داغ مے خانے سے بُت خانے کو تو جا پہنچا
تیری تعریف یہ اے مردِ خدا اَور ہوئی

اُنہیں نفرت ہوئی سارے جہاں سے　　نئی دنیا کوئی لائے کہاں سے
وہ توڑیں عہد لیکن فکر یہ ہے　　خدا پالا نہ ڈالے بدگماں سے
کہوں کیونکر تری باتیں ہیں جھوٹی　　زباں پکڑی نہیں جاتی زباں سے
جہاں کے ہو رہے بس ہو رہے ہم　　قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے
ترے در پر جگہ ہے داغ کی گرم
ابھی اُٹھ کر گیا ہے وہ یہاں سے

سب متاعِ دین و دنیا چاہیے　　اے ہوس تجھ کو بھی کیا کیا چاہیے
دل مقابل اُس صفِ مژگاں کے ہے　　لڑنے مرنے کو کلیجا چاہیے
اُڑ گیا بادِ خزاں سے آشیاں　　مجھ کو تنکے کا سہارا چاہیے
لینے والے کی تو کوئی حد بھی ہے　　دینے والے کو بہت سا چاہیے
داغ کو حُور و پری سے کیا غرض
آدمی اچھے سے اچھا چاہیے

اب تیرے کام کی بھی نزاکت نہیں رہی
دل توڑنے کے واسطے طاقت نہیں رہی
تغیّرِ حالِ زار کی سے تاثیر دیکھنا
میری شبیہ کی بھی وہ صورت نہیں رہی

محفل میں اُن کی رات کو یہ رعب داب تھا
پروانے کی بھی شمع سے صحبت نہیں رہی

ایسا ہوں محوِ لذتِ دیدارِ یار آپ
میرے خیال میں مری صورت نہیں رہی

سب کچھ دیا ہے داغ کو شاہِ نظام نے
آبائی اُس کی گرچہ ریاست نہیں رہی

دل میں فرحت جو کبھی آتی ہے — اپنے رونے پہ ہنسی آتی ہے
کیوں صبا کو نہ بناؤں قاصد — ابھی جاتی ہے ابھی آتی ہے
یہ سبب کیا ہے جدھر جاتا ہوں — سامنے تیری گلی آتی ہے
پیشوائی کو تری گلشن میں — نکہتِ گل بھی اُڑی آتی ہے

مجرمِ عشق ہوئے تم اے داغ
اب وہاں سے طلبی آتی ہے

دل میں کیا مہرباں نہیں آتی — بات کہنے میں ہاں نہیں آتی
کس طرح قول کے ہوں وہ سچّے — میرے منہ میں زباں نہیں آتی
ہے طبیعت بھی اپنی ہرجائی — کس جگہ یہ کہاں نہیں آتی
کام کر جائے گی یہ خاموشی — ہم کو آہ و فغاں نہیں آتی

داغ ہی جانتا ہے طرزِ وفا
تم کو اے مہرباں نہیں آتی

دل جو ناکام ہوا جاتا ہے — شوق کا کام ہوا جاتا ہے

لطفِ ایذا طلبی کیا کہیے　　درد آرام ہوا جاتا ہے

آج کل کثرتِ عشاق سے عشق　　شیوۂ عام ہوا جاتا ہے

دیکھ کر مست وہ کافر آنکھیں　　خونِ اسلام ہوا جاتا ہے

داغ کے پاس جو آؤ تو ابھی

دور الزام ہوا جاتا ہے

حسنِ ادا بھی خوبیٔ صورت میں چاہیے

یہ بڑھتی دولت ایسی ہی دولت میں چاہیے

طوبیٰ ہو یا ہو سرو ترا بانکپن کہاں

انداز بھی تو کچھ قد و قامت میں چاہیے

میں تجھ سے پوچھتا ہوں مرے دل کا فیصلہ

دنیا میں چاہیے کہ قیامت میں چاہیے

یہ عشق کا ہے گھر کوئی دارالاماں نہیں

ہر روز واردات محبت میں چاہیے

معشوق کے کہے کا برا مانتے ہو داغ

برداشت آدمی کی طبیعت میں چاہیے

شعلے دلِ پُرسوز سے اُٹھتے ہیں غضب کے

یہ آگ نہیں وہ جو رہے خاک میں دب کے

اللہ رے کیا پاس رقیبوں کا ہے تم کو

محشر میں طرف دار ہوئے بات ہو

دربارِ سلاطیں تو نہیں آپ کی محفل
عاشق بھی کہیں رہتے ہیں پابندِ ادب کے

اللہ رے ترا بانکپن اُف رے تری سج دھج
قربان تری گھات کے صدقے تری چھب کے

داغوں سے محبت کے ہے دل صورتِ گلزار
اِن پھولوں کی اے داغ بہار آئی ہے اب کے

نقشے ہیں یہ اب دیدۂ دیدار طلب کے
رہ جاتی ہے پلکوں میں نگہ ضعف سے دب کے

مسجد میں تو گنتی کے مسلمان ہی دیکھے
مے خانے میں جلوے نظر آئے ہمیں سب کے

کیا سخت گھڑی تھی کہ مری آنکھ لڑی تھی
یہ درد یہ آزار یہ آلام ہیں جب کے

سوتے نہیں اس وہم سے وہ بسترِ گل پر
ڈالیں تنِ نازک پہ نشاں پھول نہ دب کے

اب عاقبتِ کار کی تم خیر مناؤ
بس داغ مزے لوٹ چکے عیش و طرب کے

طرزِ دیوانگی نہیں جاتی
ہوش کی یوں تو لی نہیں جاتی

دیکھ اُس چشمِ مست کو زاہد
تجھ سے اتنی بھی پی نہیں جاتی

اُڑ گئی ہے [illegible]
چھوڑ کر وہ گلی نہیں جاتی

گرچہ بلبل ہزار نالاں ہو گلِ تر کی ہنسی نہیں جاتی
وقتِ آخر ہوا مگر اے داغ
ہوسِ زندگی نہیں جاتی

میرے پیامبر سے انہیں برہمی ہوئی
یارب کسی کی بات نہ بگڑے بنی ہوئی
واعظ مئے طہور کی خواہش ہے اس لیے
دنیا میں جو شراب ہے اپنی ہے پی ہوئی
بچ کر نہ چلیے راہ سے میری جنابِ خضر
یہ رہروی ہوئی کہ سلامت روی ہوئی
صبحِ شبِ وصال نہ تھا کوئی میرے پاس
اک شمع ساری رات کی وہ بھی جلی ہوئی
کی چھیڑ چھاڑ داغ نے تم سے بُرا کیا
اب درگزر کرو کہ خطا جو ہوئی ہوئی

مہماں سرائے دہر میں دس آئے دس گئے
اتنا مگر ہے فرق کہ کچھ پیش و پس گئے
جس وقت میکدے نے توبہ کا سامان کر لیا
کچھ بادل آسمان پر آ کر برس گئے
رہ رو سے فرطِ شوق میں چھوٹا ہے قافلہ
ہم آگے آگے مثلِ صدائے جرس گئے

کیوں آشیاں نہ آتشِ گل نے جلا دیا
برباد عندلیب کے سب خار و خس گئے
سب آئے اُن کی بزم سے اُن کا پتا نہیں
کیا جانے جا کے داغ کس آفت میں پھنس گئے

وہ سنتے ہیں جو دل سے کان رکھ کر داستاں میری
مزے لیتی ہے میرے نطق کے کیا کیا زباں میری
لحاظ و پاس کیسا گفتگو جب دو بدو ٹھہری
نہ رُکتی ہے زباں اُن کی نہ تھمتی ہے زباں میری
سلیقہ بات کا جب تجھ کو اے پیغامبر آئے
ترے دل میں ہو دل میرا زباں میں ہو زباں میری
محبت کا ہو جس دم قحط گاہک دل کے آتے ہیں
گراں ہوتا ہے جب سودا تو چلتی ہے دکاں میری
سُناؤں کس کو جو کچھ عمر بھر آنکھوں سے دیکھا ہے
کہ طولانی بہت ہے داغ ہاں یہ داستاں میری

مکتوبات

راج کمار چندن ــــــــــــــ الف ۷۷، گوڑ بخشی نگر جموں ۱۸۰۰۰۱

برادر محترم نذیر پوری صاحب ـــ آداب

دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں السباق کے حوالے سے، اور مجروح صاحب (سلطانپوری) کے خط سے متعلق مجروح صاحب کا خط [اگست تا ستمبر ۱۹۹۷ء] خط کو دیکھ کر خوشی ہوئی، زبان کی باریکیوں پر مجروح صاحب جیسے لوگ ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس لئے بھی خوشی ہوئی کہ باوجود اس کے کئی غیر سنجیدہ لوگوں نے مجروح کے خلاف ایک اندولن سا رسائل میں چھیڑ رکھا ہے، یہ لوگ مجروح کو سے

بس اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر ؎ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوشِ بہار ؎ رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

جیسے اشعار کے حوالے سے بھی نہیں جانتے اور چھوٹی موٹی باتوں یا ایک لفظ پر تنے پر طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ مجروح کب سے، اب تک زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے۔

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا ؎ کرتا نہ میں گناہ تو گناہِ عظیم تھا

دوسری بات صرف اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ مجروح کی کہی ہوئی بات کو لوگ سند نہ مان لیں، حوالے کے طور پر پیش نہ کر دیں۔ وہ یہ کہ "مین میکھ" درست ہے، مین میگھ معلوم نہیں کیسے مجروح صاحب نے لکھ دیا، میکھ کو سنسکرت اور ہندی میں मेष لکھا جاتا ہے ष کے برابر اردو میں کوئی حرف نہیں۔ شِ بھی نہیں کھ بھی نہیں اور خ بھی نہیں۔ اس لئے کسی نے میخ لکھا کسی نے میکھ لکھا، لیکن ہم دونوں کو درست نہیں مانتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ میگھ تو ہرگز درست نہیں، میگھ کا مطلب ہے بادل گرہ یا نکشتر کسی بھی صورت میں میگھ نہیں کہا جاتا۔ مجروح صاحب نے بہت عمدہ بات کہی ہے اور اردو والوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے کہ محاورہ اصل میں آیا کہاں سے ہے۔ مین اور میکھ، جنم کنڈلی کے آخری اور پہلے گرہ ہیں۔ جیسے گھڑی کی سوئیاں کسی وقت ۱۲ کے بعد اور ایک کے پہلے یعنی ساڑھے بارہ بجے کے آس پاس ہیں اسی طرح گرہوں کی دشا مین اور میخ کے درمیان ہوتی ہے۔ ابھی پہلے گرہ کی دشا پوری طرح متاثر

کن نہیں ہوتی۔ اور آخری گرہ کے ساتھ بھی پوری طرح غائب نہیں ہوتی۔ ایسے وقت میں جیوتشیوں کی الگ الگ آرا ہوتی ہیں ایک ودوان کہتا ہے یہ حالات مین کی وجہ سے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے وہ تو ختم ہو چکا اب جو بھی مصائب ہیں وہ میکھ کی وجہ سے ہیں۔ مین اب بے اثر ہے جو بھی جپ' شانتی کرانی ہے میکھ کی کراؤ اور آدمی پریشان ہو کر کہتا ہے' پنڈت مین میخ نکالے جا رہے ہیں میری جان مصیبت میں ہے۔۔ اس لئے میری درخواست ہے مین میکھ یا مین میخ کو غلط نہ مانا جائے۔ مجروح صاحب نے یہ ٹھیک سے سنا نہیں یا کسی نے انہیں غلط اطلاع دی ہے۔

آپ کو کالی داس گپتا رضا صاحب کی سرپرستی حاصل ہے یعنی عزت کی پگڑی اسباق کے سر پر موجود ہے۔ مجروح صاحب سے آپ اصرار کر کے ضرور لکھواتے رہیں' ہم جیسے لوگوں کو رہنمائی ملتی ہے۔ پروین کمار اشک کو اس کے اچھے اشعار کے لیے مبارکباد۔

● ملک تماسے ——————— پونہ

اسباق کے اگست ۹۶ء تا دسمبر ۹۶ء کے شمارہ میں محترم کالی داس گپتا رضا صاحب کا مضمون' خاک پونوی' پڑھ کر ساٹھ سال پیشتر کا زمانہ یاد آ گیا جب میں بھیونڈی (بھیمڑی) کے اینگلو اردو ہائی اسکول (حالیہ ایس۔ ایچ۔ اے رئیس ہائی اسکول) کا طالب علم تھا۔ خاک صاحب ہمارے اردو کے مدرس تھے۔ اس وقت بھیونڈی ایک پر سکون قصبہ تھا جس کی آبادی ایک لاکھ سے کم رہی ہوگی۔ یہ وہ وقت تھا جب شہر کے باشندے نہ صرف ایک دوسرے سے آشنا تھے بلکہ اس وقت کے واحد اینگلو اردو اسکول کے اساتذہ کے ناموں سے بھی واقف تھے۔ خاک صاحب پورے شہر میں شیخ جناب کے نام سے معروف و مقبول تھے۔ اساتذہ و طلباء کے دلوں میں ان کا بڑا احترام تھا۔

خاک صاحب احمد نگر کے مہربابا کے بڑے معتقد تھے۔ وہ ایک وسیع النظر' سریع الحس اور رقیق القلب انسان تھے۔ انسانیت اور انسان دوستی کی باتیں کرتے کرتے اکثر ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جایا کرتی تھیں جس کا طلباء پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ ان کی باتیں طلباء کے دلوں میں اتر جایا کرتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے مجھ جیسے کئی طلباء کے دلوں میں انسان دوستی کے بیج بوئے تھے۔ ان کے طلباء جو ابھی بقید حیات ہیں آج بھی ان کا نام احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔

خاک صاحب کی شعر گوئی کا بھی گاؤں میں چرچا تھا۔ میرے حافظہ میں آج بھی دو شعر محفوظ ہیں جو ان سے منسوب کئے جاتے تھے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

آیئے آپ شوق سے قلب شہید ناز میں ؎ صورت ناز دیکھئے آئینہ نیاز میں!!
مقدر کی ہیں باتیں جب مقدر پھوٹ جاتے ہیں ؎ تو لب تک آتے آتے لاکھ ساغر ٹوٹ جاتے ہیں

دوسرے شعر کا مضمون انگریزی ضرب المثل

There is many a slip between the cup and the lips سے ماخوذ ہے۔

خاک صاحب کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا جس سے کم لوگ واقف ہوں گے۔ وہ ایک باکمال کرکٹ کھلاڑی تھے۔ بلے بازی اور گیند اندازی دونوں میں انھیں دخل تھا لیکن ان کی بلے بازی زیادہ زوردار ہوا کرتی تھی۔ وہ ہماری ٹیم کے کپتان تھے اور مجھے بھی ان کی قیادت میں کھیلنے کے مواقع ملے تھے۔

ان کی شخصیت میں جو بھی خوبیاں ہوں گی مجھے وہ ہمیشہ ایک شفیق استاد رحم دل انسان اور انسانیت کے پرستار کی حیثیت سے یاد رہینگے۔

● شمیم انجم وارثی ـــــــــــــــ کلکتہ

زیر نظر شمارہ ہر لحاظ سے جاندار اور شاندار ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ "السباق" آپ کے حسن ادارت کا آئینہ ہے، گوشہ مضامین کا کیا کہنا بار بار پڑھنے کے باوجود بھی احساس تشنگی کم نہیں ہوتا۔ مجھ میں نہیں آتا محترم کالی داس گپتا رضا کو کن لفظوں میں خراج تحسین پیش کروں، میں بے جھجک یہ کہہ سکتا ہوں کہ محترم کی شخصیت دنیائے اردو ادب کے لئے قابل صد احترام ہے، محترم رام لعل (مرحوم) کی کہانی "اماں" پسند ہی نہیں آئی بلکہ بہت پسند آئی موصوف کی موت سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے، کاش! وہ ہمارے درمیان کچھ دن اور رہتے۔

غزلوں کے انتخاب میں آپ نے کچھ زیادہ ہی مروت سے کام لیا ہے۔ آپ بہتر جانتے ہیں کہ غیر معیاری چیزوں سے رسالے کا ادبی نکھار مجروح ہو جاتا ہے، امید کہ آئندہ اس نقطے پر ملحوظ فرمائیں گے۔ نظموں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر بقیہ حضرات متاثر کن ہیں، نثریے خوب اور بے لاگ ہیں، مکتوبات کے کالم میں محترم مجروح سلطان پوری صاحب کا خط قدرے دلچسپ ہے۔

داغ دہلوی نمبر کا اعلان باعث مسرت ہے۔ اللہ آپ کے ارادوں کو مضبوط بنائے سچ پوچھئے تو آپ کی ذات سے بہت ساری اُمیدیں وابستہ ہیں ●●

ساجد حمید ——————— شموگہ

پتہ نہیں ہمارے بزرگ ادیب و شعراء (چند) نئے الفاظ کی اختراع کو جائز نہیں سمجھتے حالانکہ زبان مالامال اور وسیع الفاظ کے اختراع ہی سے ہوتی ہے اس پر اتنا واویلا عبث ہے۔ اگر وہ ان الفاظ کو برتنا نہ چاہیں تو کون انھیں کہتا ہے کہ وہ استعمال کریں۔

رام لعل کی کہانی اور بائیو ڈیٹا دے کر آپ نے اچھا کیا اسباق کو نئے رنگ روپ میں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی مبارک ہو!

منیر حیدر ——————— کویت

"اسباق" یقیناً خوبصورت اور معیاری مجلہ ہے۔ جسے دیکھکر یک گونہ انبساط محسوس کر رہا ہوں۔ غنیمت ہے کہ اب بھی ہندوستان میں آپ جیسے لوگ اُردو کی آبیاری کر رہے ہیں۔ ورنہ عرب ممالک میں ہندوستانی لوگوں کی بالخصوص نئی نسل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے اردو بولنا وہ باعثِ توہین سمجھتے ہوں شاید ان کے نزدیک یہ محض ہم پاکستانیوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ اُردو میں بات کرو تو جواب انگریزی میں دیتے ہیں۔ خیر یہ تو یونہی بات نکل آئی۔ آپ بُرا مت منانا۔ میرے ہاتھ میں جو شمارہ ہے یہ اگست تا دسمبر ۹۶ء کا ہے۔ اس میں جناب رام لعل کا بائیو ڈیٹا چھاپا گیا ہے۔ جو تحقیق کرنے والوں کیلئے خاصی آسانیاں پیدا کرے گا۔

مرحوم موجودہ عہد کے بڑے نامور افسانہ نگار تھے۔ ان کی موت کا تمام اہلِ ادب کو دُکھ ہوا۔ مجھے ان کی موت کی خبر جوہر جھنجھنوی صاحب نے دی تھی۔ جو گزشتہ چند ماہ سے کویت میں اپنے بچوں کے پاس ریٹائرڈ لائف گزارنے چلے آئے ہیں۔ برادرم نوریہ کار نے رام لعل کی یاد میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں پاک و ہند کے کئی ایک ادیب و شاعر شریک ہوئے تھے اور انھیں زبردست خراج تحسین پیش کیا تھا اور ان کی موت کو ایک سانحہ قرار دیا تھا۔

دفتر اسباق کا نیا پتہ۔ سہ ماہی اسباق ' سائرہ منزل ' سروے نمبر ۲۳۰ بی پلاٹ نمبر ۱۰۲ ۔ دیمان درشن لین، کاؤنٹ روڈ ۔ پونہ ۴۱۱۰۳۲ M. S.

SW Zaki
AKOLA. 97
تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف اور مؤلف ماہرِ غالبیات، محقق اور شاعر
کالی داس گپتا رضاؔ